طلوعِ اسلام

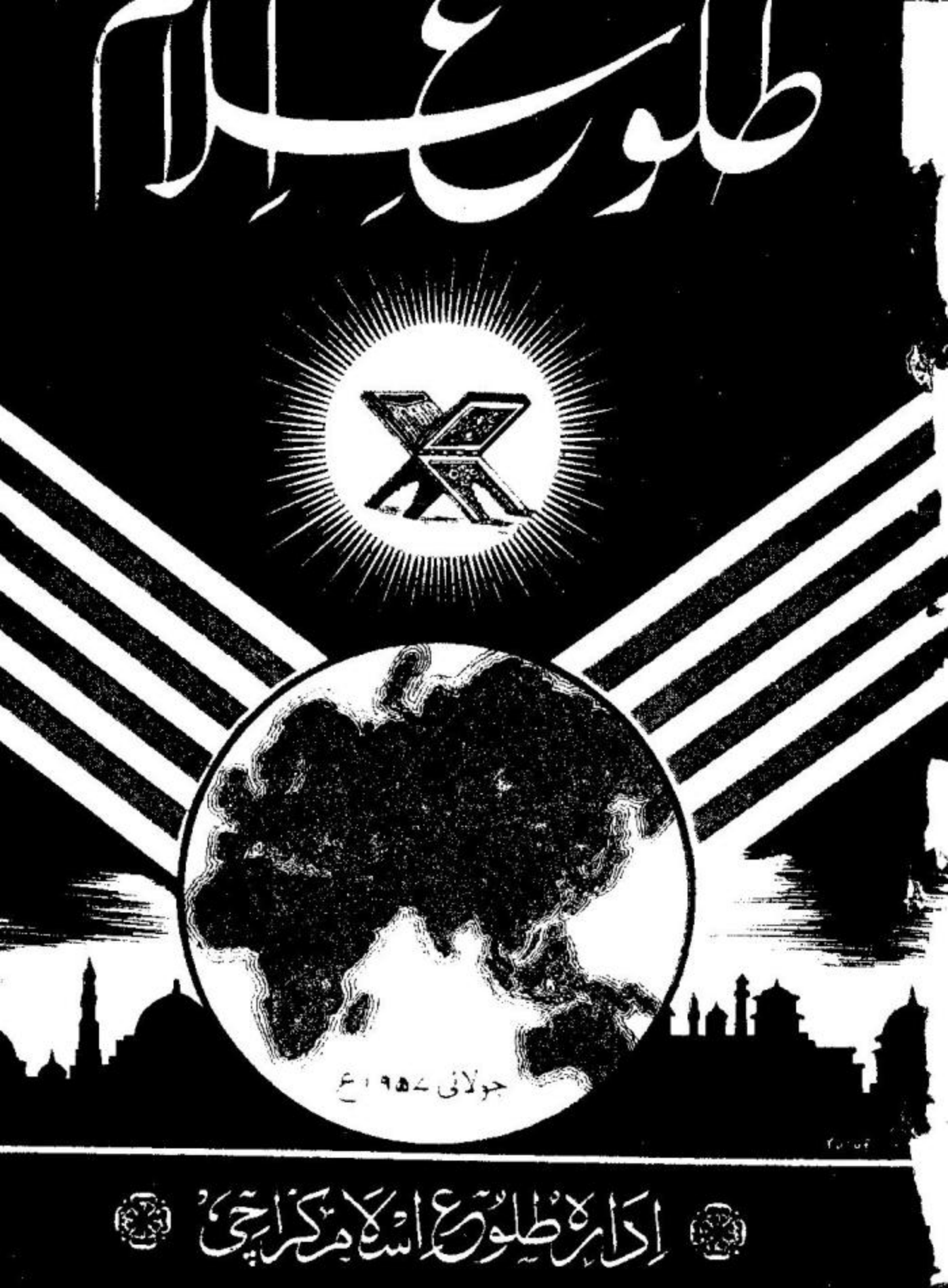

جولائی ۱۹۵۷ء

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ، آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ۔ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر ۴۱۴۸۸
خط و کتابت کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۱۵۹/۳- ایل (پی۔ ای سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی

جلد ۱۰ | جولائی ۱۹۵۷ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

لمعات		۲ ـــــ ۸
آل ورلڈ مسلم کانفرنس		۹ ـــــ ۱۶
مجلس اقبال		۱۷ ـــــ ۲۷
رابطۂ باہمی		۲۸ ـــــ ۳۰
آدم کا فردوس بریں	محترم (رحمت اللہ صاحب طارق مکہ معظمہ)	۳۳ ـــــ ۴۱
اُردو میں نماز		۴۳ ـــــ ۴۸
مشرقی ممالک میں قانون سازی کی تحریک	علامہ صبحی محمصانی بیروت)	۴۹ ـــــ ۶۴
نقد و نظر		۶۵ ـــــ ۷۳
تاریخ کا ایک اہم سوال	محترم مولوی محمد ابراہیم صاحب ناگی)	۷۴ ـــــ ۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گذشتہ اپریل، اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی تھی۔

ادکاڈہ کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ یہاں ملٹری ڈیری فارم کے ایک مزدور اسماعیل نے بھوک اور غربت سے تنگ آکر اپنے تین بچوں کو نہر میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ اس افسوسناک واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ ۹ اپریل کو جب اسماعیل کو ۵۵ روپے تنخواہ ملی تو لوگوں کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کی ساری پونجی ختم ہو گئی اور وہ یہ سوچنے لگا کہ گھر اور بچوں کی ضروریات کیسے پوری کروں۔ پریشانی اور مایوسی کے اسی عالم میں وہ جب گھر پہنچا تو وہاں بچے بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ باپ سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ اس نے چاروں بچوں کو سائیکل پر بٹھایا اور نہر پر لے گیا۔ وہاں بچوں کو یہ دلاسا دیا کہ تم نہاؤ اور میں تمہارے لئے مٹھائی اور نئے کپڑے لے کر آتا ہوں۔ بچے جب نہانے لگے تو باپ نے تین بچوں کو ڈبو دیا۔ مگر آٹھ سالہ بچہ باپ سے لپٹ گیا اور اس نے گھر پہنچ کر اپنی ماں کو یہ سارا واقعہ بتایا۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ پولیس نے اطلاع ملنے پر ملزم کو گرفتار کر لیا۔ غرق شدہ تین بچوں کی عمر دس سال۔ سات سال۔ اور پانچ سال تھی۔ (بحوالہ اعتصام۔ بابت ۳ مئی ۱۹۵۷ء)

مارچ ۱۹۵۵ء میں کراچی میں ایک نوجوان نے اسی قسم کے حالات سے مجبور ہو کر، اسٹیٹ بینک کی دیوار کے ساتھ ٹکر مار کر خودکشی کی کوشش کی تھی جس پر اسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا۔

نہ یہ خبر انوکھی ہے اور نہ یہ واقعہ غیر معمولی ہے۔ قریب قریب ہر روز، اور ہر شہر میں اس قسم کے واقعات ہوتے اور اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم نے جس مقصد کے لئے اسے شائع کیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ یہ درست ہے کہ خودکشی جرم ہے اور جو اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس کا فریضہ ہے کہ اسے گرفتار کرے اور اس پر مقدمہ چلائے اور عدالت کا فریضہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کی صورت میں اسے سزا دے کر جیل خانے بھیجدے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت یہ نوجوان شہر میں مارا مارا پھرتا تھا کہ اسے کہیں روزگار مل جائے اور اسے روزگار نہیں ملتا تھا جس وقت وہ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے باوجود، بھوکے پیٹ، کوئی چھت تلاش کرتا تھا جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے۔ اور اسے چھت نہیں ملتی تھی، تو کیا اُس وقت بھی کسی کا فریضہ تھا یا نہیں

کہ اس کے لئے روزگار مہیا کرے۔ روزگار نہیں ملتا تو اُس کے کھانے کے لئے روٹی اور رہنے کے لئے مکان کا انتظام کرے؟ اُس وقت اس چودہ پندرہ لاکھ کی بھری بستی میں اُس کی مصیبت تنہا اُس کی مصیبت اور اس کی پریشانی تنہا اس کی پریشانی تھی۔ اُس وقت کسی کا فریضہ نہیں تھا کہ اُس کی مصیبت کا اس کا ہاتھ بٹائے اور اس کی پریشانی میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن جب اس نے تنگ آکر مکر ماری تو اس سے بہت سے فرائض بیدار ہو گئے! یہ ٹھیک ہے کہ اقدام خودکشی جرم ہے لیکن (مذکورہ صدر حالات میں) خودکشی کرنے والا اس جرم کا اتنا ذمہ دار نہیں جتنا ذمہ دار وہ معاشرہ ہے جو اسے اس اقدام پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت کے اٹل قوانین (جو عدل کی صحیح بنیادوں پر قائم ہیں) اس فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں۔ اور جب وہ معاشرہ پوچھتا ہے کہ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے تو اُن سے کہا جاتا ہے اس جرم کی کہ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) جو فرد تمہارے معاشرہ میں تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ بھوکا ہوتا تھا تو تم اُس کے کھانے کا انتظام نہیں کرتے تھے اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (۹۰/۱۴) اس فرد کے کھانے کا جو تم سے اتنا قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) یا اس گرد آلود خاک نشین محتاج کا جسے کاروبار کے لئے کوئی رستہ نہیں ملتا تھا۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۰/۱۶)

اور آپ کو معلوم ہے کہ فطرت کی عدالت سے اس جرم کی سزا کیا ملا کرتی ہے؟ وہ ان تمام خوش حالیوں کو چھین لیا کرتی ہے جو اس نے عطا کر رکھی ہوں (بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۶۸/۲۷) اور آسمان کی بلندیوں پر رہنے والوں کو زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا کرتی ہے۔ (وَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲)

عذرا سے چیرہ دستیاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اگست ۱۹۵۵ء میں لاہور سے خبر آئی تھی کہ وہاں ایک بال بچوں والی خاتون نے برسوں کی بیماری اور مسلسل فاقوں سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ اس پر ہم نے لکھا تھا۔

اگر پاکستان کا مجوزہ اسلامی دستورِ معاشرہ کے اس قسم کے جگر خراش اور روح فرسا حالات کا اطمینان بخش علاج اپنے اندر نہیں رکھتا تو سمجھیے کہ اسے اسلام کو دور کی بھی نسبت نہیں۔ اسلام کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا واحد اور مکمل حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر وہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا اطمینان بخش حل نہیں پیش کر سکتا تو ہمارا یہ دعویٰ کبھی سچا نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لئے قرآن نے اس نظام کو پیش کیا ہے جس کی رُو سے مملکت میں بسنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔

کیا پاکستان کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والے اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھیں گے؟

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے ۱۳ اگست کا روزنامہ تسنیم آیا جو جماعت اسلامی کا ترجمان ہے اس میں مندرجہ صدر واقعہ کے متعلق ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے اس خط میں وہ (اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد) پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ

> ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی وارداتیں کافی ہوتی رہتی ہیں۔ اخبارات انھیں نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں بعض معاصر نے غریب کی قدیمی کہانی کا نام لے کر اس میں اپنے مخصوص مقاصد کے تحت پُر فریب مستقبل اور وعدوں اور امیدوں کا وہ رنگ بھرنا شروع کر دیا ہے کہ جب ذرائع دولت اجتماعی قبضہ میں ہوں گے تو اس کو خزانہ کرنے کے بجائے اسے غربا کے مصرف میں اس طرح سے دیدیا جائے گا جس سے ان کے لئے دنیا جنت بن جائے گی۔

اس کے بعد وہ یہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

> اس موضوع پر اسلامی تعلیمات میں کچھ ابہام نہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ دین مبین میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کے مرتکب کے لئے وعید وارد ہے کہ وہ عالم برزخ میں اور حشر کے بعد اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جس میں اس نے غلطی سے مداوا سمجھ کر اپنے آپ کو مبتلا کر لیا تھا۔ زہر کھانے والا بار بار زہر کھائے گا اور مر مر کر جئے گا خنجر سے کام تمام کرنے والا خنجر ہی گھونپتا پھرے گا اور پھندا لگانے والا پھانسی ہی پاتا رہے گا۔ گویا جان جانِ آفریں کی ہے جس نے دی ہے۔ اسی کا کام ہے کہ وہ اسے واپس بھی لے۔ دیگر فرائض کی طرح اس کی حفاظت کرنا بھی خدا اور نفس کی طرف سے ہم پر عاید ہونے والے حقوق کی طرح ایک فرض ہے۔ افسوس اس بات پر آتا ہے کہ باوجود اتنا ظاہر حکم اور فیصلہ موجود ہونے کے ہم نے اس کی تبلیغ میں مجرمانہ غفلت کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے خطیبوں اور واعظوں کے خطبوں اور وعظوں میں کتابی مسائل کے لچھے کے لچھے پھیلتے جائیں گے دُور از کار قصے۔ کرامات اور معجزات کو شعر خوانی کی چاشنی سے ہم ...... مزے لے لے کر منبروں سے نشر کریں گے لیکن حالاتِ حاضرہ پر کچھ نقرات پیدا کرنے سے ہماری گویائی عاجز اور عملی زندگی کی خرابیوں کا تصور پیدا کرنے اور ان سے عوام کو باز رکھنے کا مؤثر اسلوب اختراع کرنے میں ہماری تخیل عقیم ہو کر رہ گئی ہے۔

آپ نے علاج ملاحظہ فرما لیا۔ یعنی معاشرہ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے جن سے تنگ آ کر فاقہ کش، نادار بیمار، خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خودکشی ایک جرم ہے لیکن جس اسلام نے ایک فاقہ کش کو اضطراری حالت میں حرام تک کھا لینے کی اجازت دی ہے کیا اس کے ہاں ایک ایسے نادار کے لئے جس کے پاس نہ پیٹ بھر کر کھانے کے لئے روٹی ہو، نہ اپنی بیماری کے علاج کے لئے پیسہ اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ ان غریب سے وعظ کہے جائیں لیکن جو ان کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں انھیں اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت سمیٹتے چلے جائیں بشرطیکہ وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال کر ان فتویٰ دینے والوں کی مفت خوری کا انتظام کرتے رہیں؟

یاد رکھئے! یہی ہے ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ وہ اسلام جو دنیا میں کمیونزم کے جہنم کو اس تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ سے کوئی فضا بھی محفوظ نہیں نظر آتی۔ اگر پاکستان میں اس قسم کے اربابِ شریعت کا

تجویز کردہ اسلامی دستور نافذ ہوگیا تو سمجھ لیجئے کہ اس کے دروازے کمیونزم کے جہنم کے لئے چوپٹ کھل جائیں گے اور اس وقت (عام مسلمانوں پر تو جو بیتے گی، بیتے ہی گی) خود وہ تمام قوتیں جو آج کمیونزم کی روک تھام کے لئے اس قدر روپیہ صرف کررہی ہیں دانتوں میں انگلی دبائے بصد حسرت و یاس کہہ رہی ہوں گی کہ آهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۹۰/۶) ہم نے اتنی دولت ناحق ضائع کی! (طلوع اسلام ۵۵ء ص ۲۰)

پاکستان کا دستور مرتب ہوگیا۔ اس پر حکومت نے چراغاں کیا اور ملک کی تمام مذہبی جماعتوں اور علمائے کرام نے اسے اسلامی دستور قرار دے کر مجلس آئین ساز کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ یعنی اس دستور کے مرتب کرنے پر جس میں مفلسوں اور فاقہ کشوں کی مصیبتوں کا کوئی حل موجود نہیں۔

اب اوکاڑہ کے مندرجہ صدر ہوش ربا اور روح فرسا حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے جماعت اہل حدیث کے مؤقر ترجمان الاعتصام نے (اپنی ۸ مئی کی اشاعت میں) پہلے تو اسماعیل (مذکور) کے متعلق لکھا ہے کہ "جو شخص کشاکشِ حیات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے سے بہت جلد مایوس ہو جاتا ہے وہ انتہائی درجہ کا بزدل ہے...... ایسے شخص کی کارگاہ حیات میں کوئی قیمت نہیں اور ایک کوڑی اس کا مول نہیں"۔ اور اس کے بعد کہا ہے۔

> لیکن ہمارا کام اسی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم ایسے شخص کو محض ملامت کریں اور اس کے غلط کردار پر طعن زن ہوں۔ ایک آزاد معاشرہ میں جو شخص اس انتہائی ناروا حرکت کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت پورے سماج پر طنز کرتا ہے اور لوگوں کو تلقین کرجاتا ہے کہ جو گھناؤنے اسباب و عوامل اس کی یا اس کے کنبہ کی موت کا ذریعہ بنے ہیں، انھیں ختم کرنے کی سعی کی جائے۔ دولت و سرمایہ کی موجودہ تقسیم میں جو ناہمواریاں ہیں، انھیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے اور معاشی عدم توازن کا سدباب کیا جائے۔

اس تبصرے سے ہمارے دل میں بے اختیار جذبات اطمینان و امتنان بیدار ہونے شروع ہوگئے کہ غنیمت ہے کہ ان گوشوں سے بھی یہ آواز سنائی دینے لگی کہ دولت و سرمایہ کی موجودہ تقسیم میں جو ناہمواریاں ہیں انھیں رفع کرنے کی کوشش کی جائے اور معاشی عدم توازن کا سدباب کیا جائے۔ ورنہ آج تک تو ان حلقوں سے یہی صدائیں بلند ہوتی تھیں کہ دین میں روٹی کا مسئلہ لے آنا کمیونزم ہے اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی دعوت دینے والے فتنہ پرواز اور ملحد و بے دین ہیں، خواہ وہ اس کی تائید میں قرآن اور سنت کو بھی پیش کیوں نہ کردیں۔

اس کے بعد الاعتصام میں لکھا ہے۔

> آخر یہ کیوں ہے کہ ایک شخص تو ہر نوع کے اسباب تعیش کے ساتھ پورے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرے اور جدھر کو اس کا رخ ہو جائے مصاحبوں اور خدام کی ایک فوج کی فوج اس کے آگے پیچھے ہو انواع و اقسام کے کھانے اس کے دسترخوان پر چُنے جائیں اور متنوع غذائیں اطباء و حکماء کے احترام اس کے سامنے رکھ دی جائیں۔ اس کو چھینک بھی آجائے تو طبیب اعلیٰ

ڈاکٹر بڑھ کر اس کی نبض پکڑ دیں۔

لیکن دوسری طرف اسی معاشرہ کا وہ طبقہ ہے جس کی زندگی کا انداز اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی خوراک، ان کا لباس، ان کی زندگی قطعی طور پر اس کے برعکس ہے۔ غربت و افلاس کی حد ہے کہ تن ڈھانپنے کو ان کے پاس چیتھڑا اور پیٹ پالنے کو ان کے پاس معمولی قسم کی خوراک بھی میسر نہیں۔ مزدوری اتنی کم، تنخواہ اتنی تھوڑی اور آمدنی اتنی محدود کہ گزر اوقات تک ممکن نہیں۔ انسان اور انسان میں یہ فرقِ مراتب اور ان میں یہ تفاوتِ مدارجِ زندگی کی دوڑ میں ایک شخص کو بالکل مایوسی کے کنارے جا کھڑا کرتے ہیں۔

کس قدر صحیح فرمایا ہے ہمارے اس مؤقر جریدہ نے۔ اس کے بعد آپ یہ دیکھنے کے منتظر ہوں گے کہ ان حضرات کی طرف سے (یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے جس کی صحیح ترجمانی کے یہ حضرات مدعی ہیں) اس فرق و تفاوت کو دور کرنے اور معاشی ناہمواریوں اور عدمِ توازن کو مٹانے کے لئے کیا طریق بتایا جاتا ہے؟ یہ بھی سن لیجئے۔ ارشاد ہے

لیکن تاہم اس فرق و تفاوت کے دُور کرنے کا علاج موت کو دعوت دینا نہیں ہے اور اپنے اہل و عیال کو چھرے کے آگے رکھ لینا اس کا مداوا نہیں ہے — اس کا علاج خود آگے بڑھنا ہے اور زندگی کی مشکلات پر مردانہ وار قابو پانا ہے۔

علاج ملاحظہ فرما لیا آپ نے؛ یعنی ایک مزدور، جو دن رات محنت اور مشقت کے بعد اتنا حاصل نہیں کر سکتا جس سے وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکے، اسے چاہیئے یہ کہ "آگے بڑھے اور زندگی کی مشکلات پر مردانہ وار قابو پالے" کس قدر مؤثر ہے یہ وعظ اور کیسا دلآویز ہے یہ نسخہ!

آپ فرماتے ہیں کہ "آخر یہ کیوں ہے کہ ایک شخص ہر نوع کے اسبابِ تعیش کے ساتھ پورے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرے اور جدھر کو اس کا رُخ ہو جائے مصاحبوں اور خدام کی ایک فوج اس کے پیچھے ہو......" یہ اس لئے کہ شریعتِ حقہ کا فتویٰ یہ ہے کہ

اسلام نے کسی نوعیت کی ملکیت پر بھی مقدار اور ملکیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ۔ جانور استعمالی اشیاء۔ مکانات۔ سواری۔ غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔......اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان۔ اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو[1] (مسئلہ ملکیت زمین - از سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۲۳-۲۲)

ہمارا خیال ہے کہ اب مؤقر ہمعصر الاعتصام نے سمجھ لیا ہو گا کہ "یہ کیوں ہے کہ ایک شخص ہر نوع کے اسبابِ تعیش کے ساتھ پورے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرے" آپ کی شریعت اُسے اِس کا پورا پورا حق دیتی ہے۔ اور جب شریعت اس کا حق دیتی ہے تو وہ کون ہے جو اس کے خلاف لب کشائی کر سکے؟

---

[1] اگرچہ یہ اقتباس مودودی صاحب کی کتاب سے ہے لیکن ہماری مروجہ شریعت کا یہی فتویٰ ہے۔

الاعتصام نے یہ بھی کہا ہے کہ دولت و سرمایہ کی ناہمواریوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے اور معاشی عدمِ توازن کا سدِ باب کیا جائے۔ ہم حیران ہیں کہ انھوں نے یہ کیسے لکھ دیا جب کہ انہی ناہمواریوں کے جواز (بلکہ ان کے عین منشائے خداوندی کے مطابق ہونے) میں یہی حضرات قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۗ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

اللہ ہی نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے۔ پس جنھیں زیادتی دی گئی ہے وہ اپنی روزی اپنے ماتحتی کے غلاموں کو نہیں دیا کرتے کہ وہ اور یہ آپس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا یہ لوگ خدا کی نعمتوں کے منکر ہو رہے ہیں؟[1]

یا یہ کہ

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ (۲۹/۶۲)

اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے رزق کی فراخی عطا کر دے اور جس کا چاہے رزق تنگ کر دے۔

اور ان آیات کے اس مفہوم کی تائید میں اس قسم کی روایات پیش کی جاتی ہیں کہ۔

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے کہ ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے۔ یہاں تک کہ نادانی اور دانائی۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

اور یہ کہ

رزق کی ترازو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کو اونچا اور نیچا کرتا رہتا ہے۔ (بخاری، مسلم۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

اور اس کے بعد، غریبوں اور مفلسوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثر تعداد غریبوں کی نظر آئی۔ اور دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ (بخاری و مسلم۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

اور یہ کہ

فقراء جنت میں دولتمندوں سے پانسو برس پہلے داخل ہوں گے۔ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

نیز یہ کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ اے اللہ! مجھ کو مسکین بنا کر رکھ۔ مسکین مار۔ اور مسکینوں کے زمرہ میں میرا حشر کر۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ یہ کیوں؟ آپ نے فرمایا، اس لئے کہ مسکین جنت میں دولتمندوں سے چالیس برس پہلے داخل ہوں گے۔ عائشہ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے خالی ہاتھ نہ جانے دو اگرچہ کھجور کا ایک ٹکڑہ ہی ہو۔ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

کیا موقر جریدہ الاعتصام ہمیں بتلائے گا کہ ان آیات اور ان احادیث کی روشنی میں اس کا یہ ارشاد کس حد تک اسلامی تعلیم کے مطابق ہے کہ معاشی ناہمواریاں دور کی جائیں۔ اور غریب اور امیر کا فرق مٹایا جائے؟ الاعتصام نے اسی ضمن میں نہایت غم و غصہ سے لکھا ہے کہ

نہ حکومت اس کا علاج کرتی ہے اور نہ معاشرے کا اوپر کا طبقہ ہی اس پر غور کرتا ہے۔

لیکن ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ جب رزق کی تنگی اور فراخی خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور امیری اور غریبی سب تقدیر کی رو سے ہوتی ہے تو پھر حکومت اس کا کیا علاج کر سکتی ہے؟ کیا حکومت خدا کے لکھے کو مٹا سکتی ہے اور جو چیز اس کے قبضہ و اختیار میں ہے اُسے اپنے اختیار سے بدل سکتی ہے؟

---

[1] یہ ترجمہ (مولانا) محمد جوناگڑھی (مرحوم) کا ہے اور اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ جماعتِ اہلِ حدیث کے ایک ممتاز عالم شمار کئے جاتے ہیں۔ اس ترجمہ (یا مفہوم) کی تائید میں تفسیر ابنِ کثیر میں یہ روایت درج ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو ایک رسالہ لکھا کہ اپنی روزی پر قناعت اختیار کرو۔ اللہ نے ایک کو ایک سے زیادہ امیر کر رکھا ہے۔

اس مقام پر ہم اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اور اس کے علاوہ دیگر آیاتِ قرآنی جو بعد میں درج کی جائیں گی، ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ان کا قرآنی مفہوم اس مفہوم سے مختلف ہے جسے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ ہم اس وقت انہی حضرات کا مفہوم سامنے لا رہے ہیں۔ صحیح مفہوم کے لئے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظامِ ربوبیت" دیکھئے۔

رزق کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

اور صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہیں لے رکھی۔

اور اسی بنا پر اس نے کہہ دیا ہے کہ

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱)

تم مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو مار نہ دیا کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔

یعنی تمام انسانوں اور ان کی اولاد کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے وہ اپنی اس ذمہ داری کو ان راستوں سے رزق پہنچا کر پورا کرتا ہے جو ان کے وہم و گمان بھی نہیں آسکتے۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵/۳) یہ رزق کس کس طریق سے ملتا ہے اس کے متعلق ایک روایت ہے کہ

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے اہل و عیال کے پاس آیا جب اس نے ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو دیکھا تو وہ جنگل کی طرف چلا گیا۔ ادھر جب عورت نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے پاس کچھ نہیں اور وہ شرم کی وجہ سے باہر چلا گیا ہے تو وہ اٹھی اور چکی پر پہنچی۔ اور اس کو صاف کیا یعنی جو کچھ اس میں تھا اس کو نکالا۔ پھر تنور کی طرف گئی اور اس کو گرم کیا۔ اور پھر خدا سے یہ دعا کی کہ اے اللہ ہم کو رزق عطا فرما۔ پھر اس نے دیکھا کہ چکی کا گڑنڈا آٹے سے بھرا ہوا ہے۔ پھر وہ تنور کی طرف گئی اور دیکھا تو اس میں روٹیاں بھری ہوئی ہیں۔ ..... اس واقعہ کا ذکر (اس آدمی نے) رسول اللہؐ سے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم چکی کا پاٹ نہ اٹھا لیتے تو چکی قیامت تک گردش کرتی رہتی اور اس سے آٹا نکلتا رہتا۔ (احمد۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

کیا الاعتصام یہ بتائے گا کہ ان حالات میں یہ فریضہ حکومت پر کس طرح عائد ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو رزق عطا کرے؟

اس مقام پر ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے (جسے ہم نہایت ادب سے پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں) اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر انسان (اور اس کی اولاد) بلکہ ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے تو یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں آدمی بھوک سے مر جاتے ہیں (اور مر رہے ہیں) تو خدا کی ذمہ داری کے باوجود ایسا کیوں ہوتا ہے؟ خدا رزق کا ذمہ دار ہو اور اس کے بعد لوگ بھوک سے مر جائیں۔ یہ بات تو بہت دور تک جا پہنچتی ہے۔؟

لیکن اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ذمہ داری حکومت کی ہے کہ وہ ہر فرد مملکت کو روزی بہم پہنچائے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت کے پاس ذرائع کون سے ہیں۔ آپ شاید کہہ دیں کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار حکومت کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے وہ اس کا انتظام اس طرح کرے کہ کوئی فرد بھوکا نہ رہنے پائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ چیز (جسے اصطلاح میں ذرائع پیداوار کا قومیانا (Nationalisation) کہتے ہیں) مروجہ شریعت کی رو سے قطعاً جائز نہیں۔ چنانچہ محترم مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ

سب سے پہلی چیز جو تمام اصلاح طلب عناصر کو صاف صاف سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے..... اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (مسئلہ ملکیت زمین صفحہ ۱۰)

چونکہ یہ سوالات بڑے اہم ہیں، اس لئے ہم شکر گزار ہوں گے اگر محترم جریدہ الاعتصام (یا کسی اور مذہبی جماعت کا آرگن) اس کی تصریح کر دے کہ شرعی نقطۂ نگاہ سے ان مشکلات کا حل اور ان سوالات کا جواب کیا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تاکہ پھر کوئی اسماعیل اپنی اولاد کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنے پر مجبور نہ ہو۔

آل ورلڈ مسلم کانفرنس

یعنی

مسلمانانِ عالم کا بین الملّی اجتماعِ عظیم

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمن امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں تو وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا ہے یہ ہے کہ کونسی

ایک مشکل سوال

شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں لیکن انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے وہ کہتا ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا۔ تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جد و جہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت

تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے سے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا۔ مصر اور یونان۔ چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

عصرِ حاضر کا انسان

ادوارِ سابقہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینۂ فکر میں قومی محبت (patriotism) کو شرفِ انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگِ اول نے بالعموم اور اس کے بعد جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ چنانچہ اب دانایانِ مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر بکملے نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اللہ کبر پیدا کرتی ہے۔ باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں۔ حتیٰ کہ تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یوروپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلسِ اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا ونڈل وکی کا (One World) کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصورِ حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو، نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے چنانچہ ڈاکٹر (Gauid) اپنی کتاب (Man, Nature And time) میں لکھتا ہے۔

> اب جو چیز بالکل نظری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ خیال یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل ملاقات کر سکتے تھے قرآن

قرآن کی تعلیم

نے یہ بتایا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ۔

چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے اس لئے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں، خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضراتِ انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے، فرمایا کہ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﱙ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ — کہ تمہاری اُمت ایک امتِ واحدہ ہے اور اس کی وجہ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے اور اس وحدتِ انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رکھی جا سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو، سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کی رُو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصور کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلام کا آخری رکن ہے۔

حج سے مفہوم

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے جو انسانی تقاضوں کا ترجمان ہے۔ اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیرِ قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت، یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کر لیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کر لیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطورِ مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادتِ آدمیت کا کفیل ہو۔ ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان، مقامِ منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردِ عمل کیا ہو گا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں۔ اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی، جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آ جائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک امتِ واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند، اور کوئی اندازِ بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے۔ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں۔ اور اس کی غایت قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

قیامِ انسانیت

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند

ہوسکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ قیاماً للناس۔ کسی خاص قوم، خاص جماعت، خاص ملک خاص ملت، کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قِیَامًا لِّلنَّاسِ۔

کہا جاسکتا ہے کہ آج اقوامِ متحدہ کی مجلس (U.N.O) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن وسلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصد پیشِ نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقعہ ایک خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیمان کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایک عبدِ مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میری نمازیں اور میری قربانیاں۔ میرا جینا اور میرا مرنا۔ سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے۔ کسی اور غرض کے لئے نہیں۔ اور چونکہ اللہ کی ذات تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس

عہد و پیمان

لئے اس عہد و پیمان سے مقصود یہ ہے کہ میری تمام جد وجہدِ زندگی ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس اجتماعِ عظیم سے پہلے تمام نمائندگان فداکارانہ انداز سے خدا کے گھر یعنی ملتِ حنیفہ کے مرکزِ محسوس کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور اس طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھیراتے ہیں۔ اس نصب العین کو دل میں لئے ہوئے، یہ نمائندگانِ نوعِ انسانی انسانیت کی فلاح وسعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ اجتماعات، بلند آہنگ دعووں کے باوجود انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہ آج تک کچھ کرسکے ہیں نہ آئندہ کرسکیں گے۔ پہلی جنگ کے بعد، اقوامِ مغرب نے جمعیۃ الاقوام (League of Nations) کی طرح ڈالی۔ لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں "کفن چوروں" کی یہ جماعت جس بُری طرح ناکام ہوئی، واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (Mr. REEVES) اپنی کتاب (Anatomy of peace) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کرکے باہمی بحث وتمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جاسکتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربے کو دُہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام (United Nations Organisation) رکھ دینے سے کامیابی ہوجائے گی۔ یہ جمعیتِ اقوامِ متحدہ کس بُری طرح ناکام ثابت ہورہی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے لکھا ہے کہ "جمعیت اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرے کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کردینا چاہیئے" اور اس کی وجہ (Mr. Reves) کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ دور نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی

کی برادری کا ہے نہ کہ بین الاقوامیت"۔ یعنی وہی چیز جسے علامہ اقبال نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم!

جمعیتِ آدم

حج سے مقصود اسی "جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھئے۔ اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئین کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طریق ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا۔ جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے۔ ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے ممبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یہ ہے برادرانِ عزیز! حج کا وہ مقصود اور دین کا وہ تصور جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ کیا آپ کو اس میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے؟ ہم نے یہ مضمون آج نہیں لکھا (جو کہا جا سکے کہ طلوع اسلام نے اب اپنے خیالات سے رجوع کر لیا ہے) یہ ایک تقریر ہے جسے (طلوع اسلام کے روحِ رواں محترم پرویز صاحب نے) ۱۹۵۰ء میں، ریڈیو پاکستان سے نشر کیا تھا اور جو ان کے مجموعۂ مضامین (فردوس گم گشتہ) میں شامل ہے۔ یہ ہے وہ طلوع اسلام جس کے متعلق آپ نے طرح طرح کی باتیں سنی ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ

پراپیگنڈہ

(۱) طلوع اسلام مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔
(۲) یہ لوگ تین نمازیں پڑھتے ہیں اور صرف نودن کے روزے رکھتے ہیں۔
(۳) یہ منکر حدیث اور منکر شانِ رسالت ہیں۔ (۴) یہ اسلاف کا احترام نہیں کرتے۔ (۵) ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی تفسیر ہم ہی جانتے ہیں اس سے پہلے کسی نے اس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ (۶) ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی ساری تاریخ کو دریا برد کر دینا چاہیئے۔
(۷) طلوع اسلام کہتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت اسلامی حکومت ہے اور اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔
(۸) یہ لوگ نہ آخرت کے قائل ہیں نہ جنت اور دوزخ کو مانتے ہیں۔

اصل حقیقت

یہ اور اسی قسم کی اور بیسیوں باتیں ہیں جو آپ آئے دن طلوع اسلام کے خلاف سنتے ہوں گے۔ لیکن یہ سب باتیں غلط ہیں اور سراسر بہتان تراشی۔

(۱) طلوع اسلام کا اعلان ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے (دیکھئے سورۂ روم۔ آیات ۳۲-۳۱) اس لئے وہ خود ایک فرقہ کیسے بن سکتا ہے۔؟

(۲) طلوع اسلام نے کبھی نہیں کہا کہ تین نمازیں اور نودن کے روزے ہیں۔ اس کا اعلان ہے کہ جس طریقہ سے اس وقت نماز پڑھی جاتی ہے اس میں کسی فرد کو کسی قسم کے ردوبدل کا حق حاصل نہیں۔ باقی رہے روزے۔ سو وہ بہ صراحت لکھتا رہتا ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں رمضان کے پورے مہینے کے روزے فرض کئے ہیں۔

(۳) حدیث کے متعلق طلوع اسلام کا کہنا صرف یہ ہے کہ جو حدیثیں قرآن کریم کے خلاف ہوں۔ یا جن سے نبی اکرمؐ یا دیگر انبیائے کرامؑ کی شان میں طعن پایا جاتا ہو وہ غلط اور وضعی ہیں۔ انہیں رسول اللہ کی حدیثیں سمجھنا ہی نہیں چاہیئے۔
باقی رہا حضورؐ کا اسوۂ حسنہ، سو ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے محترم پرویز صاحب کی عظیم القدر کتاب "معراجِ انسانیت" شائع ہو چکی ہے۔ بیسیوں کا کہنا ہے کہ سیرت نبی اکرمؐ پر اس سے بہتر کتاب (اردو زبان میں) شاید ہی لکھی گئی ہو۔ آپ اس کتاب کو دیکھ کر خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ طلوع اسلام کے نزدیک حضورؐ کا مقام کیا ہے۔؟

(۴) اسلاف کے متعلق طلوع اسلام کا کہنا صرف اس قدر ہے کہ ان کی کتابوں میں لوگوں نے (سازش یا غلطی سے) ایسی باتیں بھی شامل کر دی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ ہمیں اس کا اعلان کر دینا چاہیئے کہ ایسی باتیں ان بزرگوں کی نہیں ہو سکتیں۔ کوئی سچا مومن قرآن کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔

(۵) تفسیر قرآن کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کریم ہمیں بار بار فکر و تدبر کی تلقین کرتا ہے اس لئے ہمیں قرآن کو سمجھ کر پڑھنا اور اس میں اس طرح غور و فکر کرنا چاہیئے کہ آج دنیا جن مشکلات میں مبتلا ہے اس سے ان کا حل معلوم کیا جا سکے۔ اس نے اس کا بھی کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ قرآن کریم کے متعلق یہ کہتا ہے وہ وحی خداوندی کی طرح غلطیوں سے مبرّیٰ اور ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہے۔ وہ ہر ایک کو قرآن میں غور و فکر کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

(۶) تاریخ کے متعلق طلوعِ اسلام صرف اس قدر کہتا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے ہماری تاریخ میں ایسی باتیں ملا دی ہیں جو ہمارے بزرگوں کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ کو دوبارہ لکھنا چاہیئے اور اس میں سے اس قسم کی تمام باتیں نکال دینی چاہئیں۔

(۷) طلوعِ اسلام کسی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں سمجھتا جب وہ حکومت اللہ کے قوانین و احکام کو مملکت میں نافذ کرے اور اس کے اربابِ حل و عقد خود ان احکام کے پابند نہ ہوں۔ اس قسم کی حکومت کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے جس کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسول کی اطاعت کے ہوتی ہے۔

(۸) طلوعِ اسلام مرنے کے بعد کی زندگی اور اس میں اعمال کی جزا اور سزا کو ایمان کا جزو سمجھتا ہے۔ البتہ وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں سرفرازی اور سربلندی کی زندگی بھی ہے۔ اور دینِ خداوندی کے خلاف چلنے کا نتیجہ ذلت اور رسوائی کی زندگی جس میں ہم مبتلا ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ طلوعِ اسلام کا صحیح مسلک کیا ہے اور اس کے خلاف کس قدر دروغ بافی اور بہتان تراشی سے کام لیا جا رہا ہے؟

آپ کی حیرت!

آپ حیران ہوں گے کہ طلوعِ اسلام کے خلاف اس قسم کے جھوٹے پراپیگنڈہ کی مہم کیوں جاری ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اس مہم کے ذمہ دار ہیں اور ایسا کرنے سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات آپ کی سمجھ میں اس وقت آئے گی جب آپ یہ دیکھیں گے کہ طلوعِ اسلام کی دعوت کیا ہے اور اس دعوت کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے اور کیوں ہو رہی ہے۔ غور سے سنیئے۔

* * *

طلوعِ اسلام کی دعوت

طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ

(۱) نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اس نظام کے اندر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی حیثیت سے قرآن میں نازل کیا اور جسے نبی اکرمؐ اور حضور کے صحابہؓ نے عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کی بنیاد یہ ہے کہ اربابِ حکومت کا کام لوگوں سے اپنے احکام اور قوانین منوانا نہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ اللہ کے قانون کو دنیا میں رائج کریں اور اس کی روشنی میں ملت کا نظم و نسق ملت کے نمائندوں کی باہمی مشاورت سے کریں۔

(۲) اسلامی مملکت میں تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (مثلاً روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج وغیرہ) کی پوری پوری ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر کسی مملکت میں ایک آدمی بھی بھوکا سو جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

(۳) اتنی بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پیداوار کے تمام ذرائع اسلامی نظام کی تحویل میں رہیں۔ اس لئے اسلامی نظام میں نہ زمینداری باقی رہ سکتی ہے نہ جاگیرداری۔ نہ اس میں سرمایہ داری کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ ساہوکاری کی۔ اس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک ہو اور غریب کسان اس کے لئے اپنا لہو پسینہ ایک کر دیں۔ اس میں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص لاکھوں روپے جمع کر کے بیٹھ جائے اور غریب آدمی بھوکے مرتے رہیں۔ نہ ہی یہ کہ امیر آدمیوں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے (یا دیسے ہی) بڑے بڑے منصب سنبھال لیں اور غریبوں کے بچوں کو کوئی پوچھے ہی نہیں۔ اسلامی نظام میں ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع یکساں طور پر میسر ہوں گے۔ امیر اور غریب کی کوئی تخصیص نہیں ہوگی چونکہ یہ سب کچھ خدا کے احکام کے مطابق ہوگا اس لئے اس میں اور کمیونزم میں زمین اور آسمان کا فرق ہوگا۔

(۴) اسلامی نظام میں یہ بھی نہیں ہوگا کہ آپ محنت مشقت سے کما کر لائیں اور ایک طبقہ، محض آپ کو وعظ و نصیحت کر کے یا تعویذ تاگے دے کر آپ کے گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ لہٰذا اسلامی نظام میں (جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا ہے) مفت خوروں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ خواہ وہ مولوی ہوں خواہ پیر۔ اس میں سب کو کام کرنا ہوگا اور (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوگی۔

مخالفت کیوں؟

اب آپ نے سمجھ لیا، برادرِ عزیز! کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟ یہ مخالفت ہوتی ہے حکومت کے غلط کاروں کی طرف سے۔ سرمایہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی طرف سے۔ اور پیشہ ور مولویوں کی طرف سے جن کا ذریعۂ رزق کوئی نہیں۔ یہ مخالفت دراصل طلوعِ اسلام کی نہیں بلکہ اسلامی نظام کی مخالفت ہے جس میں اس قسم کے لوگوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔

لیکن یہ لوگ یہ کہہ کر تو اس کی مخالفت کر نہیں سکتے کہ یہ اس قسم کے نظام کی دعوت کیوں دیتا ہے وہ اس کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں تاکہ کوئی طلوعِ اسلام کی آواز نہ سنے اور اس کے قریب نہ جائے۔

یہ ہے وہ مہم جو اس کے خلاف جاری ہے۔

ہماری درخواست

ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے آپ اسے اسی طرح مان لیں۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ طلوع اسلام کے لٹریچر کا خود مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ واقعی ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس کے بعد آپ کو جھوٹ اور سچ کا پتہ چل جائے گا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم آپ کسی اتوار کی صبح (نو بجے) اُس درسِ قرآن میں شریک ہو جائیے۔ جسے محترم پرویز صاحب اپنے مکان ۳/۱۵۹ ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی (جیل روڈ سائڈ) پر دیتے ہیں۔ اور اپنے کانوں سے سن لیجئے کہ وہاں کس قسم کا دین پیش کیا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کا مشن

طلوع اسلام کوئی نیا ادارہ نہیں۔ یہ ۱۹۳۸ء میں دہلی میں قائم ہوا تاکہ پاکستان کی تحریک میں قائدِ اعظم مرحوم کی سعی کا ساتھ دے۔ حصولِ پاکستان کے بعد یہ ۱۹۴۸ء سے مسلسل اور متواتر قرآن کریم کے پیغام کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے۔ ماہوار مجلہ (طلوع اسلام) اس کی دعوت کا نقیب ہے۔ اسے دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ اس پایہ کا کوئی اور مجلہ آپ کو کہیں ملتا ہے؟ ادارہ کی طرف سے ڈیڑھ درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھئے اور دیکھئے کہ قرآن کو اس انداز سے کہیں اور بھی پیش کیا جاتا ہے؟

آپ سے کچھ نہیں مانگتا

طلوع اسلام آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ اس نے آج تک کسی سے مالی امداد نہیں لی۔ نہ حکومت سے۔ نہ کسی زمیندار سے۔ نہ کارخانہ دار سے۔ نہ سوداگر سے۔ نہ اس نے کبھی قربانی کی کھالیں اکٹھی کی ہیں، نہ زکوٰۃ کا روپیہ لوگوں سے لیا ہے۔ وہ آپ سے بھی کچھ نہیں مانگتا۔ اس کی درخواست صرف اتنی ہے کہ اگر آپ از خود اس کا اطمینان کر لیں کہ یہ ادارہ واقعی صحیح کام کر رہا ہے تو اس کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو دوسروں تک پہنچانے میں اس کا ساتھ دیجئے۔ تاکہ یہاں وہ نظامِ خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہماری اور تمام نوعِ انسانی کی مشکلات از خود حل ہو جائیں گی۔ والسلام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

3/159-L ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی —— خاتمۃ الکتاب —— دُعا

حضرت علامہؒ نے مثنوی اسرارِ خودی کا خاتمہ ایک دعا پر کیا ہے۔ یہ دعا کیا ہے؟ تپش و خلش، سوز و گداز، درد و داغ کا مُرقعِ آتشیں ہے جو ان کے قلبِ عشق آگیں کی گہرائیوں سے ابھر کر ایک آہِ سوزاں کی شکل میں ان کے لبِ آتش نوا تک آ پہنچی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک دعا شدتِ آرزو کا نام ہے۔ (لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔ اس پر شاہد ہے) جس قدر آرزو بلند اور پاکیزہ اور اسکی شدت تند و تیز ہوگی۔ اسی قدر دعا میں جذب و اثر کی دنیا رقص کرتی دکھائی دے گی۔ اس دعا میں سب کچھ موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اسقدر حسین اور تابناک دکھائی دیتی ہے۔ دعا کا پہلا شعر حمد کا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی
جانِ ما باشی و از ما می رمی

بظاہر اس شعر میں کوئی خاص ندرت دکھائی نہیں دیتی لیکن اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اقبال نے ایک نرم و نازک تشبیہ سے حقائق کی دنیا ایک چھوٹے سے مصرعہ میں سمو کر رکھدی ہے۔

یہ سوال الٰہیات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے (اور اسی وجہ سے بڑا مشکل اور نازک سمجھا جاتا ہے) کہ خدا اور کائنات کا تعلق کیا ہے؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ کائنات اور خدا کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا ایک مشین اور مشین بنانے والے کا تعلق ہوتا ہے۔ مشین بنانے والا (انجینئر) جب مشین بنا دیتا ہے تو وہ مشین اس کے وضع کردہ اصول کے مطابق خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسے مشین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں۔ چنانچہ مشین کہیں اور ہوتی ہے اور اس کا بنانے والا کہیں اور۔ اس تصور کی رو سے خدا کو کائنات سے دور اور الگ تھلگ سمجھا جاتا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اسے ماورائیت (TRANSCENDENCE OF GOD) کا تصور کہا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ (DEISM) ہے۔ یعنی ایک ایسا خدا جو کائنات سے باہر اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہے۔ اس سے تجسیمِ خدا (خدا کے صاحبِ جسم ہونے کا) تصور پیدا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ کائنات اور خدا ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نہ خدا کائنات سے الگ

ہے۔ نہ کائنات خدا سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ اسے فلسفیانہ انداز میں (IMMANENCE OF GOD) کا تصور کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ وحدتِ وجود (PANTHEISM) کا عقیدہ ہے یعنی ہر شے خدا ہے۔

قرآن کی رو سے یہ دونوں تصور باطل ہیں۔ اس کی رو سے خدا (IMMANENT) بھی ہے اور TRANSCENDENT بھی۔ وہ کائنات کے اندر ہے لیکن اس میں محبوس نہیں۔ وہ کائنات سے باہر ہے لیکن اس سے خارج نہیں۔ وہ کائنات کا خالق ہے لیکن اس کی مخلوق (کائنات) اسی کی الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ اسے خدا کا امر (یا DIRECTIVE FORCE) کہا جاتا ہے۔ اسے زمان (TIME) میں ابدیت (ETERNITY) حاصل ہے اس لئے ہو الاول والآخر اس کی شان ہے۔ وہ مکان (SPACE) میں لامحدودیت (INFINITY) کا مالک ہے۔ اس لئے ہو الظاہر والباطن اس کی صفت ہے۔ وہ کائنات سے باہر کہیں الگ تھلگ بھی نہیں بیٹھا۔ اور نہ ہی کائنات کی ہر شے خدا ہے۔ اس لئے تجسیم اور وحدتِ وجود کے دونوں تصورات غیر قرآنی ہیں۔

یہ ہے خدا اور کائنات کا تعلق قرآن کی رو سے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ مسئلہ کس قدر مشکل اور نازک ہے۔ علامہ اقبال نے اسے ایک تشبیہ میں یوں حل کیا ہے کہ

اے چو جاں اندر وجود عالمی

یعنی خدا کائنات میں اس طرح ہے جیسے انسانی جسم میں جان ہے۔ جان انسانی جسم (مادہ) کی پیداوار نہیں ہوتی۔ نہ ہی وہ جسم کے اندر اس طرح محبوس ہوتی ہے کہ جسم کے فنا ہو جانے سے وہ بھی فنا ہو جائے۔ لیکن وہ جسم سے باہر بھی نہیں ہوتی۔ جسم اسی کے زور پر زندہ اور نامی ہوتا ہے۔ جان نگاہوں سے دیکھی نہیں جا سکتی (اس لئے وہ باطن ہوتی ہے) لیکن اس کے باوجود اس کا ظہور (MANIFESTATION) اس قدر نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود محسوسات و مدرکات کی حدود سے ماورا ہوتی ہے لیکن اس کی توانائی کے مظاہر محسوس و مدرک ہوتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبال نے ایک تشبیہ سے کتنے اہم اور نازک مسئلہ کو سلجھا دیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اسی حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا ہے جب کہا ہے کہ

جانِ ما باشی و از ما می رمی

تو ہماری جان بھی ہے اور اس کے باوجود ہم سے دور دور بھی رہتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ کوئی نگاہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ وہ قریب بھی ہے اور بعید بھی۔ ہم روحِ خداوندی (اسکی الوہیاتی توانائی) کے بغیر کچھ نہیں۔ لیکن ہم خدا بھی نہیں۔ وہ ہر وقت ہر مقام میں ہے لیکن مکان اور زمان کی نسبتوں سے منزہ اور مبرّا بھی ہے۔

اس کے بعد دوسرا شعر بھی حمد کا ہے جس میں کہا ہے کہ

نغمہ از فیضِ تو در عودِ حیات
موت در راہِ تو محسودِ حیات

اس شعر میں اقبال نے پھر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ زندگی مادہ کی پیدا کردہ نہیں بلکہ خدا کی عطا فرمودہ ہے۔ آواز اگرچہ بنسری سے نکلتی ہے لیکن وہ بنسری کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ لے نواز (بنسری بجانے والے) کی مسیحا نفسی کی رہینِ کرم ہوتی ہے۔ اس کی شعلہ نوائی کے بغیر بنسری ایک چوبِ خشک سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس لئے اقبال نے خدا سے کہا ہے کہ سازِ حیات میں نغمہ تیرے فیضِ کرم سے ہے اور تیری راہ میں مرنا اس قدر عظیم عزّ و شرف کا حامل ہے کہ ایسی موت پر خود زندگی بھی حسد کرتی ہے۔

اس حمد کے بعد عرضِ مدعا پر آتے ہیں اور کہتے ہیں۔

باز تسکینِ دلِ ناشاد شو
باز اندر سینہ ہا آباد شو

تاریخ کے ادوار میں ایک بار (یعنی عہدِ رسول اللہ ؐ والذین معہٗ میں) ایسا ہوا تھا کہ تو انسانیت کے ویران سینے میں آباد ہو کر مضطرب و بیقرار قلوب کے لئے وجۂ سکون و طمانیت بنا تھا۔ میری آرزو یہ ہے کہ تو ایک مرتبہ پھر ایسا ہی کر کہ پھر وہی طمانیت بخش کامرانیوں اور تسکین آمیز شادکامیوں کا دور واپس آجائے اور تو پھر وجۂ شادابیٔ قلب و نظر بن جائے۔

باز از ما خواہ ننگ و نام را
پختہ تر کن عاشقانِ خام را

ایک بار پھر ایسا ہو جائے کہ اپنی عزت و ناموس سب تیرے راستے میں قربان کر دیں۔ ہم اپنی عزیز سے عزیز متاعِ حیات تیری مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کر دیں اور اس طرح اپنے دعوئے ایمان کی پختگی کا ثبوت دیں۔ ہم پھر ویسا ہی کریں جیسا اُس دور کے مسلمانوں نے کیا تھا۔

از مقدر شکوہ ہا داریم ما
نرخِ تو بالا و نا داریم ما

ایک عرصۂ دراز کی بے عملی اور سست روی سے ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہم ہمیشہ تقدیر کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر خود بنانی چاہیئے تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تجھے حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی قیمت دینی پڑتی ہے۔ آرام، چین، جان، مال سب کچھ اس راہ میں نثار کرنا پڑتا ہے۔ اور ہم ہیں کہ ہمارے پاس تجھے خریدنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ نہ پختہ ایمان، نہ حسنِ عمل۔ لیکن بایں ہمہ ہم اپنے سینے میں تیرے لئے ایک زندہ آرزو اور پائندہ ولولہ رکھتے ہیں۔ تو اس کی طرف نگاہ رکھ اور ہماری تہی دامنی کی طرف نہ جا۔

از تہیدستاں رخِ زیبا مپوش
عشقِ سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش

ہم غریب و نادار ہیں ہم سے منہ نہ چھپا۔ ہم جانتے ہیں کہ جس قسم کا عشق سلمانؓ اور بلالؓ کا تھا اسے خریدنے کے لئے بڑی گراں بہا متاعِ حیات کی ضرورت ہے۔ لیکن ہماری آرزو یہ ہے کہ تو (ہماری تہیدستی کے پیشِ نظر) اپنا نرخ کچھ کم کر دے اور اس عشق کی دولت ہمارے پاس کم داموں پر بیچ دے۔

چشمِ بے خواب و دلِ بیتاب دہ
باز ما را فطرتِ سیماب دہ

ہمیں ایسی آنکھ عطا فرما جو تیری یاد میں نیند سے بیگانہ رہے۔ ایسا قلب عنایت کر جو تیری طلب و جستجو میں ہمیشہ مضطر و بیقرار رہے تو ہمیں پھر وہی فطرتِ سیماب عطا کر دے جو تیرے لئے ہر وقت مصروفِ جد و جہد اور مشغولِ سعی و عمل رہے۔

آیتے بنماز آیاتِ مبیں
تا شود اعناقِ اعدا خاضعین

ہمیں اپنی کھلی ہوئی نشانیوں میں سے ایک ایسی نشانی دکھا جس سے ہمارے دشمنوں (یعنی تیرے دین کے دشمنوں) کی گردنیں جھک جائیں۔ ہمیں پھر ایسی طاقت عطا فرما جس سے باطل پرست قوتیں خاسر و نامراد ہو کر سرنگوں ہو جائیں۔

کوہ را آتش خیز کن ایں کاہ را
ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

یہ ہمارا سرمایۂ زیست ہو کر درد ناتواں دکھائی دے رہا ہے اسے آتش فشاں پہاڑ میں تبدیل کر دے اور اس کی شعلہ فشانیوں سے ہر طاغوتی قوت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔

اس کے بعد حضرت علامہ یہ بتلاتے ہیں کہ ہماری یہ زار و زبوں حالت ہو کیسے گئی؟ کہتے ہیں۔

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کارِ ما فتاد

جب امتِ مسلمہ نے وحدت و یک جہتی کے مشرب و مسلک کو خیرباد کہدیا اور امتِ واحدہ فرقوں میں تبدیل ہو گئی۔ تو ہمارے ہر کام میں ہزاروں رخنے پڑنے شروع ہو گئے ہماری کامیابی کا راز ملت کی وحدت میں تھا۔ جب یہ وحدت گئی تو ہماری سرفرازیاں اور سربلندیاں بھی ختم ہو گئیں اب ہماری حالت یہ ہے کہ

با پریشاں در جہاں چوں اختریم
ہمدم و بے گانہ از یک دیگریم

ہم تعداد کے لحاظ سے تو کثیر ہیں لیکن ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بظاہر ایک دوسرے سے واقف اور قریب ہیں۔ لیکن درحقیقت ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا اور اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے

محور کے گرد گھومتا ہے۔ ہمارا ایک نصب العین حیات اور ایک روشِ زندگی نہیں۔ میری دعا یہ ہے کہ

باز ایں اوراق را شیرازہ کن
باز آئینِ محبت تازہ کن

تو ہمارے بکھرے ہوئے اوراق کی ایک مرتبہ پھر شیرازہ بندی کر دے تو ایک بار پھر اپنے آئینِ محبت کو تازہ کر دے۔

باز ما را بر ہماں خدمت گمار
کارِ خود با عاشقانِ خود سپار

پھر ہمارے ذمے وہی کام لگا دے جو ایک مرتبہ ہم سے لیا گیا تھا۔ اُس وقت تیرے نظامِ ربوبیت کا پروگرام ہمارے ہاتھوں تکمیل تک پہنچا تھا۔ تیرے قوانین کی مجرد اور بسیط حقیقتیں ہمارے دست و بازو سے عملاً متشکل ہو کر برگ و بار لائی تھیں۔ تو ایک بار پھر وہی خدمت ہمارے سپرد کر دے۔

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش
قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

ہمارے کاروانِ ملت کو اس منزل سے آشنا کر دے جہاں ہر ایک تیرے قانون کے سامنے جھکتا ہے۔ ہمیں وہ قوتِ ایمانی عطا کر دے جو حضرت ابراہیم کو ارزاں کی گئی تھی۔ اور جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر آفل سے منہ موڑ کر دامن فشاں اس راستے پر چل نکلے تھے جو سیدھا تیرے آستانے پر لے جانے والا تھا۔ اس راستے میں ان کے لئے دنیا کی ہر مصیبت عین راحت اور ہر قربانی وجہ صد شادمانی تھی۔

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن
آشنائے رمزِ الا اللہ کن

ہمارے عشق کو پہلے وہ تخریبی قوت عطا کر دے کہ یہ ہر غیر خدائی نظام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دے۔ اور اس کے بعد وہ تعمیری سطوت بخش دے کہ یہ تیرے زندہ و پائندہ نظام کو محکم و استوار کر کے وجۂ ارتقائے انسانیت بنا دے۔

یہاں تک علامہ اقبال کی دعا درحقیقت ملت کی طرف سے دعا تھی۔ اس کے بعد وہ ایک دعا اپنی ذات کے لئے کرتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ذاتی دعا بھی دراصل اجتماعی دعا ہی ہے کیونکہ اس میں وہ ایک رفیق دمساز کی آرزو کرتے ہیں جو ان کی فکر و بصیرت کا وارث ہو اور ان کی مشن کی تکمیل کا موجب۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ ہماری راہ نمائی کرتا ہے، علامہ اقبال نے (بجز مثنوی پس چہ باید کرد کے اس مقام کے جہاں آپ نے اپنی طویل بیماری سے شفایاب ہونے کے لئے دعا کی ہے) اپنی ذات کے لئے کہیں کوئی دعا نہیں کی۔ ان کی تمام دعائیں اور تمنائیں ملتِ اسلامیہ کے لئے ہی ہوتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں ملتِ مرحومہ سے بے پناہ عشق تھا اس لئے وہ خدا سے جو کچھ مانگتے تھے اس کے لئے مانگتے تھے۔ اب اس دعا کا دوسرا حصہ ملاحظہ کیجئے۔ بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں۔

منکہ بہر دیگراں سوزم چو شمع
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع

میں دوسروں کے غم میں شمع کی طرح پگھلتا ہوں۔ میں نے شمع کی طرح اپنی محفل کو (دوسروں کے غم میں) رونا سکھایا ہے۔

یارب آں اشکے کہ باشد دل فروز　　بیقرار و مضطر و آرام سوز
کارش در باغ و روید آتشے　　از قبائے لالہ شوید آتشے

میری آرزو یہ ہے کہ مجھے وہ آنسو عطا کر دیا جائے۔ جو دلوں کو روشن اور منور کر دے جو میرے قلب کو مضطرب و بیقرار کر دے۔ جو میرا آرام اور چین مجھ سے چھین لے۔ میں اُس آنسو کو باغ میں کاشت کروں تو اس سے شعلے اگیں۔ اس کے سوز و حرارت کی خود تو یہ کیفیت ہو لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں یہ تاثیر بھی ہو کہ وہ دوسروں کی آگ کو ٹھنڈک میں تبدیل کر دے۔ یعنی قلبِ مومن کا سوز جس کے متعلق علامہ نے دوسری جگہ کہا ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(یہ آرزو درحقیقت ایک جملۂ معترضہ تھی۔ اصل مدعا پہلے شعر کے تسلسل میں یوں آتا ہے کہ)

دل بدوش و دیدہ بر فرداستم
در میانِ انجمن تنہاستم

میرا دل امتِ مسلمہ کے ماضی کے ساتھ وابستہ ہے اور نگاہ میری اس کے مستقبل پر ہے۔ لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں۔

علامہ اقبال نے یہ کچھ سنہ ۱۹۱۳ء میں کہا تھا۔ اور سنہ ۱۹۳۸ء میں (اپنی وفات سے چند دن پہلے) اسی حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں دہر　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یعنی علامہ اقبال کو پہلے دن سے اپنی زندگی کے آخری دن تک اپنی تنہائی کا احساس ستاتا رہا۔ یہ احساس اس قدر شدید اور اس کا اثر اس قدر درد انگیز تھا کہ بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شدتِ غم سے ان کی چیخیں نکل گئی ہیں۔ اور یہ غم اور بھی زیادہ الم انگیز اس لئے ہو جاتا تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو ان کا رفیق، ہم نوا اور محرمِ راز سمجھتا تھا حالانکہ اسے اس کا علم تک نہ تھا کہ اقبال ہے کیا اور اس کا پیغام کیا ہے۔ چنانچہ (وہ رومی کے الفاظ میں) کہتے ہیں کہ

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
نہ درونِ من نجست اسرارِ من

لیکن یہ تنہائی اور اس پر رونا، اقبال ہی کے ساتھ مختص نہیں۔ دنیا میں ہر داعیٔ انقلاب کی یہی کیفیت ہوتی ہے جو شخص اُس بھیڑ کے ساتھ چلتا ہے جو وراثت میں ملے ہوئے مسلک و مشرب کی فرسودہ راہوں پر آنکھیں بند کئے چلی جا رہی ہو ایک دنیا اس کے جلو میں ہوتی ہے۔ لیکن جو صاحبِ بصیرت انسان، ان فرسودہ راہوں کو چھوڑ کر حق و صداقت کا راستہ اختیار کرتا اور دوسروں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس پر ہر سمت سے پتھر پڑتے ہیں۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ اسلاف سے ترکہ میں ملے ہوئے غلط افکار و تصورات کی نگاہ فریب دنیا کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کر دیتا ہے اور اپنے تصورات سے جس جہانِ نو کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہنوز وجود میں نہیں آتا۔ لہٰذا وہ تنہا جیتا اور تنہا مر جاتا ہے۔ اسے ایک ہمدم فرزانہ کی تلاش قریہ قریہ اور کوبہ کو لئے پھرتی ہے لیکن وہ اسے کہیں نہیں ملتا۔ ایک داعیٔ انقلاب کی یہ حزن آگیں اور الم انگیز تنہائی ہزار قیامتوں کی ایک قیامت ہوتی ہے جس سے وہ بے طرح مصروفِ آہ و فغاں رہتا ہے۔ وہ اس رفیق کی تلاش میں گوشے گوشے میں پھر نکلتا ہے۔ لیکن ہر بار ناکام و نامراد لوٹ کر دل کی پوری اذیت کے ساتھ پکار اٹھتا ہے کہ

در جہاں یارب ندیمِ من کجاست
نخلِ سینایم، کلیمِ من کجاست

یا اللہ! اس دنیا میں میرا رفیق و ہمدم کہاں ہے؟ میں نخلِ طور ہوں، وہ کلیم کہاں ہے جس سے میں باتیں کر میں اسکی سنوں! ایسا ندیم کہاں ہے؟

ظالمم بر خود ستم ہا کردہ ام
شعلۂ را در بغل پروردہ ام   بکوں۔ جو میری سے ادر

میں بڑا ظالم ہوں، میں نے اپنے آپ پر بڑا ہی جور و ستم کیا ہے۔ میں نے اپنے سینہ میں ایک شعلۂ جوالہ کی پرورش کی ہے۔ اس چنگاری کو اپنے سوزِ جگر اور خونِ دل سے نشو ونما دے کر ایک شعلہ بنایا ہے۔

شعلۂ غارت گرِ سامانِ ہوش
آتشے افگندہ در دامانِ ہوش

وہ شعلہ جس نے میری عقل و خرد اور ہوش و حواس کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

عقل را دیوانگی آموختہ
علم را سامانِ ہستی سوختہ

وہ شعلہ عشق جس نے عقل کو دیوانہ پن سکھا دیا۔ جس نے علم کی ہستی کو جلا کر خاک بنا دیا۔

آفتاب از سوزِ او گردوں مقام
برقہا اندر طوافِ او مدام

ہاں! وہ شعلۂ عشق جس سے سورج نے تھوڑا سا سوز مستعار لیا تو اس سے وہ فلک کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ وہ شعلہ کہ بجلیاں اس کے گرد ہمیشہ طواف کرتی ہیں۔ لیکن یہ شعلہ مجھے یونہی راہ چلتے نہیں مل گیا۔

ہمچو شبنم دیدۂ گریاں شدم
تا امینِ آتشِ پنہاں شدم

میں ایک عمر شبنم کی طرح کسی کے دردِ محبت میں روتا رہا۔ تب کہیں جا کر اس سوزِ نہاں اور آتشِ پنہاں کا امین بنا۔

شمع را سوزِ عیاں آموختم
خود نہاں از چشمِ عالم سوختم

میں نے شمع کو تو کھلی مجلس میں جلنا سکھا دیا۔ لیکن خود ساری دنیا کی آنکھوں سے اوجھل، چپکے چپکے۔ اندر ہی اندر جلتا رہا۔ اور کسی کو اس سوز و دروں کی خبر تک نہ ہونے دی۔ یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی تا آنکہ

شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

یہ آگ میرے ہر بن مو سے شعلے بن کر نکلنے لگی۔ میری فکر کی ایک ایک رگ سے آگ برسنے لگی۔

عندلیبم از شررہا دانہ چید
نغمۂ آتش مزاجے آفرید

میری فکر کی عندلیب نے دانہ کی جگہ آگ کی چنگاریاں کھائی ہیں۔ اور پھر اس کے تارِ گلو سے وہ نغمۂ آتش ریز ہوا ہے جس نے ہر خس و خاشاک کو جلا کر رکھ دیا ہے۔

میری آتش نوائی اور شعلہ مزاجی کا تو یہ عالم ہے۔ لیکن جس زمانے میں میں پیدا ہوا ہوں اس کی یہ حالت کہ

سینۂ خصرِ من از دلِ خالی است
می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

دل میں شعلوں کا بھڑکنا تو ایک طرف، اس عہد کے سینے میں سرے سے دل ہی موجود نہیں۔ مجنوں بے چارہ تڑپ رہا ہے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے محمل ہی محمل ہے۔ اس سے لیلیٰ غائب ہے۔ یہ مادہ پرستی کا دور ہے جس میں پیکر ہیں لیکن بے جان۔ الفاظ ہیں لیکن بے معنی۔ جس میں سینوں میں دل نہیں اور دل میں سوز آرزو نہیں جس دور میں مقصدِ حیات صرف طبعی تقاضوں کی تسکین ہو۔ اس میں عشق اور سوزِ عشق کی تلاش عبث ہے۔ لہٰذا (علامہ اقبال نالاں ہیں کہ) مجھے اس دور میں اپنا کوئی محرمِ راز نہیں ملتا اور مشکل یہ ہے کہ

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

شمع اپنے جلنے کے لئے محفل چاہتی ہے۔ اسے اگر تنہا جلنے کے لئے کہدیا جائے تو وہ شمعِ محفل نہیں بلکہ چراغِ مزار بن جائے گی۔ اس لئے علامہ اقبال فریاد کناں ہیں کہ میرے لئے (محرم وہمرازکی عدم موجودگی میں) محفل میں تنہا جلنا کس قدر دشوار ہے۔ یوں تو میرے گرد بہت سے پروانے جمع ہو جاتے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ میری شعلہ نوائی کا اہل ہے۔

انتظارِ غمگسارے تا کجا
جستجوئے رازدارے تا کجا

میں نے ایک محرمِ راز رفیقِ راہ کی تلاش میں اپنی عمر صرف کردی۔ یہ سعیٔ لاحاصل بالآخر کب تک جاری رکھی جائے۔

اے ز رویت ماہ و انجم مستنیر
آتشِ خود را ز جانم باز گیر

اب میری (ہار تھک کر) التجا یہ ہے کہ آتشِ پنہاں کو میرے سینے سے واپس لے لے۔ تیری ذات وہ ہے کہ جس سے چاند اور ستاروں میں روشنی کی نمود ہے۔ اس لئے یہ حرارت جو میرے سینے میں یوں رائگاں جا رہی ہے مجھ سے لیکر کسی نتیجہ خیز مقام میں صرف کر۔

ایں امانت باز گیر از سینہ ام
خارِ جوہر برکش از آئینہ ام

اس امانت کو میرے سینے سے واپس لے لے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نور سے خود میرا پیکرِ گل آئینہ بن رہا ہے لیکن یہ جوہر آئینۂ میرے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے تو اسے واپس لے لے۔

یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ
عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ

یا اس سوز و حرارت اور تپش و خلش کو میرے سینے سے واپس لے لے اور یا ایک پرانا رفیق عطا کر دے جو میرے عشقِ عالم سوز کے لئے آئینہ بن جائے۔ میں اس میں اپنے درد و داغ کا عکس دیکھ سکوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبال ایک محرمِ راز کی آرزو میں کس طرح ہمہ تن سوز تھے! وہ خدا سے ایک ہمدمِ دیرینہ مانگتے ہیں۔ اور اپنی اس طلب و آرزو کے جواز میں خود مظاہرِ کائنات کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

موج در بحر است و ہم پہلوئے موج
ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج

سمندر میں لہروں کو دیکھئے۔ وہ سمندر کے اندر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسری لہروں کے ساتھ ہمدوش بھی۔ لہروں کی زندگی ہی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مصروفِ تگ و تاز رہتی ہیں۔

بر فلک کوکب ندیمِ کوکب است
ماہِ تاباں سر بزانوئے شب است

آسمان کو بھی دیکھئے تو اس میں بھی ایک ستارہ دوسرے ستارے کا رفیق ندیم ہے۔ چاند اگرچہ تنہا نظر آتا ہے لیکن وہ بھی لیلائے شب کے زانو پر اپنا سر رکھے ہے۔ تنہا وہ بھی نہیں۔

روز پہلوئے شب یلدا زند
خویش را امروز بر فردا زند

رات کو چھوڑ کر دن کی طرف آیئے تو یہ بھی شب تیرہ وتار کا پہلو بدلتا ہے۔ اور امروز (آج) فردا (کل) میں اپنا رفیق پاتا ہے۔

ہستی جوئے بجوئے گم شود
موجۂ بادے ببوئے گم شود

ایک ندی (ہرچند کہ تنہا نظر آتی ہے لیکن وہ) ایک ہمدم کی تلاش میں چلتی رہتی ہے تاآنکہ اپنے آپ کو دریا کی آغوش میں گم کر دیتی ہے۔ اسی طرح نسیم سحری اپنے آپ کو بوئے گل میں ضم کر دیتی ہے۔ غرضیکہ اس کائنات میں

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
میکند دیوانہ با دیوانہ رقص

تنہا کوئی بھی نہیں۔ ویرانے سے ویران تر گوشہ میں بھی دیکھئے تو ایک دیوانہ کسی دوسرے دیوانے کو ساتھ لے کر مصروف رقص نظر آئیگا۔
کائنات کو بھی چھوڑیئے۔

گرچہ تو در ذات خود یکتاستی
عالمے از بہر خویش آراستی

خود خدا کی ذات کو لیجئے۔ اگرچہ وہ یکہ و تنہا اور بے ہمتا ہے۔ لیکن اس نے بھی اپنے لئے کائنات کو آراستہ و پیراستہ کر رکھا ہے۔
مختصر یہ کہ عالم انفس ہو یا آفاق، مخلوق ہو یا خلاق، ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ساتھی اور رفیق ہے۔ لیکن۔

من مثال لالۂ صحراستم
درمیان محفلے تنہاستم

ایک میں ہوں کہ کائنات میں لالۂ صحرا کی طرح اکیلا ہوں۔ میں بھری مجلس میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں۔ میرا کوئی رفیق اور دمساز نہیں

خواہم از لطف تو یارے ہمدمے
از رموز فطرت من محرمے

اے کائنات کے پروردگار! میں تیرے لطف و کرم سے ایک ایسا ہمدم و رفیق چاہتا ہوں جو میری فطرت کے رازوں سے واقف ہو۔

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ
از خیال این و آں بیگانۂ

ایسا ہمدم جو بیک وقت عقلمند بھی ہو اور دیوانہ بھی وہ تمام دنیا سے کٹ کر فقط میرا ہو جائے۔

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دلِ او روئے خویش

تاکہ میں اس متاعِ عشق کو اس کے سپرد کردوں۔ اور پھر اس کے دل کے آئینہ میں خود اپنا چہرہ دیکھ سکوں۔

سازم از مشتِ گِلِ خود پیکرش
ہم صنم او را شوم ہم آذرش

میں اپنی مشتِ خاک سے اس کا پیکر بناؤں۔ اور اس طرح "من تو شدم تو من شدی" سے ہم ایک دوسرے کی پرستش کریں۔ وہ میرا محبوب ہو میں اس کا محبوب۔ وہ میرا عاشق ہو میں اس کا عاشق۔ ہم ایک دوسرے کے پرستیدہ بھی ہوں اور پرستار بھی

یہ تھا وہ رفیق و ہمدم جس کی علامہ اقبال کو طلب و جستجو تھی۔ اور جس طلب و جستجو کو وہ اپنے ساتھ لیکر دنیا سے چل دیئے۔

علامہ اقبال کی سب سے پہلی منظوم کتاب (مثنوی اسرارِ خودی) کا اس دعا پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ "رموزِ بیخودی" شروع ہوتا ہے۔ للہ الحمد کہ ہم نے یہ طویل مسافت بالآخر منزل بہ منزل طے کر ہی لی۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

اس سلسلہ کے متعلق

ہم نے سابقہ اشاعت میں قارئین سے دریافت کیا تھا کہ مثنوی اسرارِ خودی کے بعد اس کے دوسرے حصہ (مثنوی رموزِ بے خودی) کی تشریح کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے یا اسے یہیں تک رہنے دیا جائے۔ قارئین میں سے دو ایک نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں لیکن ان کی اکثریت نے بڑی شدت اور اصرار سے کہا ہے کہ اس سلسلہ کو ضرور جاری رکھا جائے کیونکہ یہ نہ صرف اقبال کے بلکہ قرآنی مقامات کے سمجھنے میں بھی بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔

لہذا، اکثریت کے تقاضے کے پیشِ نظر فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا۔

قارئین نے یہ بھی کہا ہے کہ مثنوی کی اس شرح کو الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے۔ یہ تجویز بھی معقول ہے اور ادارہ اس کی طرف بھی ضرور توجہ دے گا۔

رابطۂ باہمی

مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام - کراچی نے پمفلٹ "اردو میں نماز" تمام کراچی میں تقسیم کئے۔ ہزاروں مسلمانوں پر حقیقت واضح ہوگئی کہ اُردو میں نماز پڑھنا کس طرح غیر قرآنی ہے۔

کراچی میں مخالفین نے جو غلط فہمیاں پیدا کی تھیں کافی حد تک دور ہو چکی ہیں۔ اتوار کے درس میں آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مستورات اور کالج کے طلبا اس مقصدِ عظیم کے لئے پیش پیش ہیں۔ بزمِ خواتین کراچی بڑی مستعدی سے کام کر رہی ہے۔ ان کی طرف سے حال ہی میں ایک پمفلٹ اسلام اور پردہ شائع ہوا ہے۔ بزم ہائے طلوعِ اسلام کو یہ پمفلٹ بھیجا جا رہا ہے۔ انھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ پوری تنظیم کے ساتھ ایک دن میں اپنے شہر کے کونے کونے میں پڑھنے والے حضرات کو تقسیم کریں۔

سالانہ کنونشن بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی نے تجویز پیش کی ہے کہ امسال طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن راولپنڈی میں منعقد کی جائے۔ مرکزی بزم نے اس پیش کش کو بہ تشکر قبول کر لیا ہے۔ کنونشن کے متعلق مزید معلومات محمد اقبال صاحب ترجمان بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی۔ "الکوثر" بالمقابل گورنمنٹ زنانہ کالج۔ مری روڈ۔ راولپنڈی سے حاصل کریں۔ حسبِ سابق کنونشن کے متعلق ضروری ہدایات، طلوعِ اسلام کی اگست۔ ستمبر اور اکتوبر کی اشاعتوں میں شائع ہوتی رہیں گی۔

انفلوئنزا کراچی میں انفلوئنزا کی وبا پھیلنے کی وجہ سے مرکزی بزم نے اپنے زیرِ اہتمام مریضوں کے علاج اور دواؤں کی مفت تقسیم کے لئے ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی چار مراکز قائم کر دیئے ہیں۔ جملہ بزموں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ بھی حتی الامکان اپنے ہاں خدمتِ خلق کا ایسا انتظام کریں۔

بزمِ طلوعِ اسلام - ہنگو - ضلع کوہاٹ کے سکریٹری لکھتے ہیں کہ قرآنی مطبوعات لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ جمعرات کو اراکین بزم بعد نمازِ عشار جمع ہوتے ہیں اور اپنی زندگی قرآن کے مطابق بسر کرنے اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی تدابیر سوچتے ہیں۔

بزمِ طلوعِ اسلام - پنج کسی - ضلع ملتان یہاں ایک نئی بزم قائم ہوئی ہے۔ اس کے ترجمان چودھری نذیر احمد صاحب وکیل اور سکریٹری چودھری منظور احمد صاحب ہیں۔ ملتان ضلع کے تمام قرآنی احباب سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان سے رابطہ رکھیں اور ہر طرح کا تعاون کریں۔

بزم طلوع اسلام۔ سیالکوٹ کے ترجمان فرماتے ہیں کہ بزم اپنے حلقے کو وسیع اور رابطہ باہمی کی کڑیوں کو مضبوط کرنے میں مصروف ہے۔ ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے جاری ہے۔ پمفلٹوں کی تقسیم خاطر خواہ طور پر کی جارہی ہے۔

بزم طلوع اسلام۔ لائلپور کے ترجمان لکھتے ہیں کہ ہر ماہ میں چار اجتماعات ہوتے ہیں جن میں ایک اجتماع ایسا بھی ہوتا ہے جس میں پورے ضلع کے اراکین بزم بلائے جاتے ہیں۔ پابندیٔ وقت۔ ایفائے عہد۔ خدمتِ خلق۔ ایثار و قربانی کے جذبات سرعت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ آج کل بزم کے ترجمان گلزار حسین صاحب ہیں۔

بزم طلوع اسلام۔ پشاور کے ترجمان لکھتے ہیں کہ بزم کا جلسہ جمعہ کو سیٹھ محمد رفیق صاحب کے مکان پر ہوتا ہے۔ طے پایا ہے کہ ایک کتب خانہ صدر مقام پر کھولا جائے جس سے تعلیم یافتہ حضرات مستفید ہو سکیں۔

بزم طلوع اسلام۔ چک تحصیل اوکاڑہ یہاں ایک نئی بزم کا آغاز ہوا ہے جس کے ترجمان عبدالمجید خاں صاحب ہیں اور سکریٹری محمد اسلم اعوان ہیں تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ایک دارالمطالعہ بھی کھولا گیا ہے۔ جہاں روزمرہ کے اخبارات اور ادارۂ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔

بزم طلوع اسلام۔ قادر آباد کے ترجمان لکھتے ہیں کہ اس حلقے میں قرآنی مطبوعات کافی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اراکین اپنا کام پوری تنظیم اور حوصلے سے کر رہے ہیں۔

بزم طلوع اسلام۔ لاڑکانہ کے سکریٹری فرماتے ہیں کہ یہاں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کتب خانہ کا قیام جلد عمل میں لایا جائے گا۔ یہاں کے مقامی اخبار آفتاب نے قرآنی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے لئے دست تعاون بڑھایا ہے۔ احباب سے درخواست کی جاتی ہے کہ قرآنی مضامین اس اخبار کو بھیجیں۔

بزم طلوع اسلام۔ حیدر آباد کے سکریٹری فرماتے ہیں کہ یہاں کے اراکین پورے ولولے اور تنظیم سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی توجہ ان نونہال بچوں پر ہے جو آئندہ چل کر ہماری قوم کے امین بننے والے ہیں۔ چنانچہ اس طرف ٹھوس عملی کام شروع کیا گیا ہے جس کے نتائج کچھ وقت میں نہایت خوشگوار نکلیں گے۔

ایک خطرہ سے آگاہی بعض حضرات نے اطلاع دی ہے کہ فرقۂ اہلِ قرآن کے لوگ طلوع اسلام کی بزموں میں شریک ہو جاتے ہیں اور باہر جا کر لوگوں میں اپنے عقائد اور خیالات کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں جنھیں طلوع اسلام کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

اگر کہیں ایسا ہوتا ہے، تو یہ بہت بری بات ہے۔ تمام بزمیں اس سے مطلع رہیں۔ طلوع اسلام کے کسی گوشے سے کوئی فرقہ وارانہ بات نہیں اٹھنی چاہیئے۔

عید الاضحیٰ پر طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت میں "حج" کے متعلق جو مضمون چھپا ہے اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں

شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ عنقریب بڑے بڑے شہروں کی بزموں کو بھیجا جائے گا تاکہ اسے عید کے اجتماعات میں نہایت حسن و سکون سے تقسیم کیا جائے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض بزمیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مرکزی بزم طلوع اسلام اور ادارۂ طلوع اسلام ایک ہی ہیں۔ صورت حال یہ نہیں۔ طلوع اسلام کی تمام بزمیں اپنا الگ نظام رکھتی ہیں اور ادارۂ طلوع اسلام کو نہ ان کے نظم و نسق سے کوئی تعلق ہے نہ مالی معاملات سے۔ البتہ ادارہ کی ربلا معاوضہ، رفاقت اور تعاون تمام بزموں کو حاصل ہے۔

سکریٹری۔ مرکزی بزم طلوع اسلام
۱۲۵۔ خلیق منزل ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی

برقِ طور

استبداد ملوکیت کے مجسمہ فرعون۔ پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کے پیکر ہامان اور سرمایہ داری کی خون آشامیوں کی تمثیل قارون کے متحدہ محاذ کے خلاف صاحب ضرب کلیم کی نبرد آزمائی اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان ایک ضخیم لیکن دل کش جلد میں۔ قیمت مجلد چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی ۲۹

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

معراج انسانیت حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی؟ قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ و لایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات، ملائکہ، وحی، شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے۔

جوئے نور کاروان نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۲×۲۹/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۲×۲۹/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑے سائز کے ۴۸۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

نظام ربوبیت نوع انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا حل کیا بتایا ہے۔ دور حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قسم اول مجلد چھ روپے۔ غیر مجلد چار روپے۔

اسباب زوال امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں۔)

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ ایل (بی۔ای۔سی۔ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے ہم ہر سال جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم نو سال سے منا تے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم فشاں اور درد انگیز تصویر۔ ۲۰۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

مزاجِ شناسِ رسول پیشوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جارہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیئے۔ تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت چار روپے۔

مقام حدیث (ہر دو جلد مکمل) حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرین حدیث کون ہیں۔ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ ہر جلد تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق محیر معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از پرویز مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص بچوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔)

ملنے کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ - ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سائٹی) کراچی نمبر ۲۹

آدم کا فردوسِ بریں

(محترم رحمت اللہ طارق دارالحدیث مکہ معظمہ حجاز)

(محترم پرویز صاحب نے اپنی گرانقدر تصنیف "ابلیس و آدم" میں اس قرآنی تصور کو پیش کیا ہے کہ قصۂ آدم کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ وہ نوع انسانی کے تبدیلیٔ ادوار و اطوار کی کہانی ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس بنا پر اس قصہ میں جس جنت کا ذکر ہے وہ جنت بھی اسی دنیا کی ہے۔ اور اسے اس جنت سے کچھ تعلق نہیں جو انسان کو مرنے کے بعد اس کے اعمال کے بدلہ میں ملے گی۔ ہمارے قدامت پرست طبقے (حسب عادت) اس تصور کی بڑی مخالفت کی اور کہا کہ اسلاف کا مسلک یہی ہے کہ وہ جنت آسمانی جنت ہی تھی۔ جہاں سے حضرت آدم علیہ السلام کو نکال کر زمین پر بھیجا گیا تھا۔

محترم رحمت اللہ صاحب طارق نے اپنے اس مضمون میں بتایا ہے کہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جمہور اسلاف کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ جنت آسمانی تھی۔ انھوں نے مشہور محدث امام ابن الجوزیؒ کی کتاب "مفتاح دارالسعادۃ" کے اقتباسات سے بتایا ہے کہ ان کے اور ان کے ہم مسلک حضرات کے نزدیک یہ جنت اسی دنیا میں تھی نہ کہ آسمان پر۔

ہم اس مضمون کو اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ یہ اس باب میں قرآنی تصور کی تائید کرتا ہے۔ مضمون کے جن گوشوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ قصہ کسی ایک فرد (حضرت آدم علیہ السلام) سے متعلق ہے ہم ان سے متفق نہیں ہیں۔ جو حضرات اسکی تفصیل دیکھنا چاہیں وہ "ابلیس و آدم" میں ملاحظہ فرمائیں۔

طلوع اسلام

عنوان بالا سے ذہن فوراً کسی افسانے یا ڈرامے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں بلکہ یہاں ایک ایسی علمی تحقیق کا پیش کیا جانا مقصود ہے جو اردو لٹریچر میں پہلی بار اور بالتفصیل لکھی گئی ہے۔

دراصل اس جرأت کا باعث علامہ حافظ امام شمس الدین المعروف محدث ابن الجوزی مرحوم کی نادر کتاب "مفتاح دارالسعادۃ"

ہے. جس میں امام موصوف نے جنت آدم پر طرفین کے دلائل کو بالاستیعاب ذکر کرتے ہوئے پوری وضاحت سے اپنا ترجیحی مسلک بیان کیا ہے ـــ اور کون اس کا تصور کر سکتا ہے کہ امام صاحب جیسا متشدد محدث ۔ اس موقعہ پر تحقیقی رنگ اختیار کرے گا۔ ہم امام موصوف کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس معاملہ میں رہنمائی کی ۔ اور یقین دلاتے ہیں کہ ان کے ان تاثرات کا ترجمہ بلا تصرف پیش کیا جائے گا اپنی طرف سے صرف عنوانات یا پھر محولہ آیات کے ساتھ نمبروں اور ترجمہ کا اضافہ ہوگا ۔ وباللہ التوفیق ۔

آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ ابوالبشر آدم علیہ السلام جنت میں رہتے تھے ۔ لیکن یہ پتہ ہے کہ وہ جنت الخلد تھی یا کوئی اور جنت ؟ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ـــ ایک بڑی جماعت اور ابو مسلم اصفہانی و منذر بن سعید بن بلوطی کی تحقیق یہ ہے کہ آدم کی جنت زمین کے کسی بلند و سرسبز خطے پر تھی نہ کہ جنت الماویٰ جسے قیامت کے روز مومنوں کے لئے تیار کیا جائے گا ۔ (مفتاح دار السعادت طبع دوم ص ۱۲ . مطبوعہ از ہر بک ڈپو مصر ۱۹۳۹ء)

بیس قرآنی دلائل

(۱) اللہ تعالیٰ نے جنت کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ متقیوں کے لئے قیامت کے بعد دار المقامہ (فاطر ۳۵) یعنی دائمی اقامت گاہ ہوگی ۔ لیکن آدم اس میں قیام نہ کر سکا ۔

(۲) اسے جنت الخلد (فرقان ۱۵) یعنی دائمی جنت کہا گیا ہے ۔ لیکن آدم کو یہ دوام نصیب نہیں ہوا ۔

(۳) اسے دار الجزاء یعنی انعامات و محنت کا صلہ پانے کا مقام کہا گیا ہے نہ کہ تکالیف کا گھر ۔ اور آدم کو یہاں تکالیف و فتنوں کا سامنا کرنا پڑا ۔

(۴) اس کے متعلق وعدہ ہے کہ اس میں کوئی حزن و ملال نہیں ہوگا اور داخل ہونے والے کہیں گے کہ الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴) یعنی رب مہربان کا شکر ہے کہ اس نے جنت میں داخل کر کے تمام پریشانیاں دور کر دیں اور آدم کو یہاں بدحالی و ملال پیش آیا ۔

(۵) اسے دار القرار (غافر ۳۹) سے تعبیر کیا گیا ہے اور آدم اس میں قرار نہ پا سکا ۔

(۶) قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ وما ھم منھا بمخرجین (حجر ۴۸) یعنی جنت میں داخل ہونے والے پھر کبھی نہیں نکلیں گے ۔ اور آدم نکالے گئے ۔

(۷) اس کا وصف ہے کہ لا یمسھم فیھا نصب (حجر ۴۸ فاطر ۳۵) یعنی اس میں کوئی تکان و ذہنی ابتلاء نہیں ہوگا ۔ لیکن آدم شجرِ ممنوعہ سے شرک کر اپنا کام بگاڑ بیٹھا نہ صرف اتنا بلکہ پریشان و بدحواس ہوکر ادھر ادھر دوڑا اور اسی طرح تکان و ذہنی ابتلا کا شکار رہا ۔ حالانکہ جنت میں ان کی نفی کر دی گئی ہے ۔

(۸) اسے قرآن میں دار السلام (انعام ۱۲۷) بتایا گیا ہے لیکن آدم سلامتی سے نہ رہ سکا اور اسے انھیں آفات نے گھیر لیا جو دنیا میں ہوتی ہیں ۔

(۹) اس کی خاصیت ہے کہ لا یسمعون فیھا لغوا ولا تأثیما (واقعہ ۲۵) یعنی اس میں بیہودگی اور گناہ کی بات

نہیں ہوگی لیکن آدم نے جرم کا ارتکاب کیا اور بیہودگی سے بڑھ کر یہ کہ شیطان کے اکسانے پر معصیت کر بیٹھا۔

(۱۰) اس کی دوسری خاصیت ہے کہ لا یسمعون فیھا لغوا ولا کذابا (نبا ۳۵) اس میں دھوکا جھوٹ نہیں ہوگا لیکن ابلیس نے آدم کو جھوٹ سنایا اور قسم کھا کر دھوکہ دیا۔ (ص۱۲)

(۱۱) آدم نے جنت میں رہ کر وہ پانی پیا جسے کتاب الٰہی نے شرابا طھورا (انسان ۲۱) کہا ہے۔ یعنی تمام آفات بد سے پاک کر دینے والا۔ لیکن آدم ان آفات سے پاک نہ ہو سکا۔

(۱۲) اس کا نام مَقْعَدِ صِدْقٍ (قمر ۵۵) بھی ہے یعنی سچ کا مقام۔ لیکن ابلیس نے جھوٹ بولا اور آدم نے مان لیا۔ حالانکہ یہ مقعد صدق کے متضاد ہے۔ (ص۱۲)

(۱۳) کتاب اللہ میں جنت کو علیون (مطففین ۱۹) کہا گیا ہے۔ یعنی بلند سے بلند تر مقام۔ اور آدم کی خلافت کے متعلق ہے کہ انی جاعل فی الارض خلیفہ (بقرہ ۳۰) یعنی زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہ نہیں کہا کہ جنت الماویٰ (نجم ۱۵) پر تاکہ ملائکہ کا اعتراض صحیح ہو سکتا کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء؟ (ص۱۳ مفتاح)

(۱۴) قرآن مجید میں ہے کہ واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیھا ما دامت السمٰوات والارض الا ما شاء ربک عطاء غیر مجذوذ (ہود ۱۰۸) یعنی سعادت مند لوگ آسمان و زمین کے وجود تک یعنی دائماً جنت میں رہیں گے۔ اور یہ انعام ان کے لئے غیر منقطع (ہمیشہ کے لئے) ہوگا۔ یہاں جنت الخلد کو غیر منقطع نعمت بتلایا گیا ہے۔ اور آدم جس جنت میں بسائے گئے تھے وہ منقطع نعمت تھی۔ لہذا جنت الخلد نہ رہی (ص۳۰ مفتاح)

(۱۵) ابلیس نے آدم سے کہا کہ ھل ادلک علیٰ شجرۃ الخلد وملک لا یبلیٰ (طٰہٰ ۱۲۰) یعنی تمہیں ایسا حیات بخش شجر کیوں نہ بتاؤں جس کے چکھتے ہی تم موت سے آزاد ہو کر ایسی دنیا میں رہو جو کبھی فنا ہی نہ ہو! پس اگر آدم پہلے ہی سے جنت الخلد میں تھے تو ابلیس کو یہ کہہ کر کیوں نہ جھٹلا سکے کہ ایسی جنت تو مجھے پہلے ہی نصیب ہے؟ (ص۱۳)

(۱۶) اللہ تبارک نے جب آدم کو جنت میں بسایا تو اس وقت یہ نہیں بتایا کہ یہی جنت الخلد ہے اور تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا پڑے گا یہی وجہ تھی کہ اس نے مزید لالچ میں آ کر ابلیس کا مشورہ مان لیا۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ سبحانہ کے بتلانے میں آدم کو شک گذرا!! لہذا آدم کو عاصی کہا گیا۔ کافر نہیں کہا۔ کیونکہ شک کرنے والے کو کافر اور نافرمان کو عاصی کہا جاتا ہے۔ (ص۱۳)

(۱۷) آدم اگر جنت الخلد میں تھے تو اسے دار القدس سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں پاک مقدس لوگ ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ابلیس۔ خبیث۔ لعین۔ پاک مقدس کب تھا جو اس میں داخل ہو سکتا اور پھر آدم اس کی بات مان جاتا؟ یہ تو تھا ہی فاسق فسق عن امر ربہ اور جنت فاسقین کے لئے نہیں ہے۔ متقین کے لئے ہے اور ابلیس متقی کہاں؟ (ص۱۳)

وسوسہ کی تحقیق

امام صاحب فرماتے ہیں کہ "ہو سکتا ہے کوئی کم علم و جاہل و آداب زبان سے ناآشنا یہ کہے کہ ابلیس خود تو جنت میں نہیں گیا تھا لیکن آدم کے دل میں اس کا وسوسہ پہنچ گیا تھا؟

سو ایسے جاہل کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ مغالطہ ولاعلاج وہم میں مبتلا ہے۔ اس کا ایسا سمجھنا خود (الف) نظم قرآنی کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں ہے کہ وقاسمھما (اعراف ۲۱) یعنی ابلیس نے آدم وحوا سے قسم کھا کر بات کی اور قسم کا کھانا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ مخاطبۃ (باہمی گفتگو) اور مشاھدہ ہی سے ہی ممکن ہے جو کہ دو حاضر متکلموں (بولنے والوں) کے بغیر محال ہے :: علاوہ (ب) قرآن میں ابلیس کے اسی وسوسہ کو مخاطبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت فوسوس الیہ الشیطان قال یاآدم ھل ادلک الایۃ (طٰہٰ ۱۲۰) یعنی ابلیس نے وسوسہ ڈالتے ہوئے آدم سے کہا۔ یہاں وسوس کی تفسیر قال سے کر دی۔ نیز وسوسہ (ج) آواز سے بھی ثابت ہے۔ مثلاً رؤبہ شاعر کہتا ہے کہ وسوس یدعو مخلصا رب الفلق۔ یعنی نباتات اگلنے والے رب کو پورے اخلاص سے پکارا۔ یہاں وسوس کی تفسیر یدعو (پکارنے) سے آئی ہے جو آواز سے متعلق ہے۔ اعشیٰ شاعر کہتا ہے ؎

تسمع للحلی وسواسا اذا انصرفت
کما استعان بریح عشرق زجل

یہاں زیورات کی جھنکار کو وسوسہ کہا ہے اور جھنکار کا تعلق سماع سے ہے۔ (صـ۱۲ مفتاح)

سانپ کا قصہ کہا جاتا ہے کہ ابلیس سانپ کے منہ میں داخل ہو کر جنت پہنچ گیا تھا! اس کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں کہ " ایسا کہنا نقلی دلیل کا محتاج ہے کیونکہ آدم و ابلیس کے قصہ میں سانپ کا ذکر نہیں آیا۔ (صـ۱۶)

(۱۹) حدیث مبارک میں ہے کہ ان آدم نام فی جنتہ یعنی سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ آدم کو جنت میں نیند آ گئی تھی۔ اور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ جنت الخلد میں نیند نہیں ہوگی۔ کیونکہ نیند وفات کے برابر ہے۔ اور قرآن میں کہیں کہیں نیند کا اطلاق وفات پر ہوا ہے اور وفات کہتے ہیں حالات کے منقلب ہو جانے کو۔ اور دارالسلام انقلاب احوال سے بچا ہوا ہے۔ (صـ۱۴)

(۲۰) پس جسے عقل تسلیم کرتی اور کتاب وسنت سے جو ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدم کی جنت جنت الخلد نہیں تھی اور نہ ہی دارالبقاء۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ آدم کو جنت الخلد میں ہمیشہ ٹھہرائے اور پھر فرشتوں سے یہ کہے کہ زمین پر خلیفہ بھیجنے والا ہوں؟ (صـ۱۵)

سلف صالحین کی رائے جو لوگ کہتے ہیں کہ آدم جنت الخلد سے نکالے گئے تھے۔ یہ صرف عقیدے کی بات ہے ورنہ اس پر کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی گئی جس کی تائید قرآن وسنت یا صحابہ کے قول وتابعین کی رائے سے ہو سکتی ہو۔ نہ مسند نہ مقطوع! بخلاف اس کے جو اس عقیدے کے نہیں ہیں ان کے دلائل مضبوط ہیں۔ مثلاً

اسلام کا بڑا امام سفیان بن عیینہ تابعی۔ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ (طٰہٰ ۱۱۸) کی تفسیر میں کہتا ہے۔ کہ فی الارض یعنی جس جنت کی یہ خاصیت بتائی گئی ہے وہ جنت ارضی تھی (صـ۲۱)

مشہور علامہ عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ معارف میں لکھتا ہے کہ آدم جس جنت سے نکالے گئے تھے وہ عدن کے مشرق میں تھی صـ۲۱

مشہور صحابی ابی بن کعبؓ سے حسن بصری روایت کرتا ہے کہ (طویل حدیث کے بعد) آدم جس جنت میں رہے تھے۔ اسی میں وفات پائی اور وہیں دفن کئے گئے۔ (ص۲۱)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ سے ابوصالح روایت کرتا ہے کہ وہ اھبطوا منھا میں ھبط کی تفسیر کرتے تھے کہ ھبط فلان ارض کذا و کذا۔ یعنی فلاں شخص فلاں فلاں سرزمین پر اترا۔ یعنی وہاں کی سیاحت کی یا ڈیرہ ڈالا۔ مقیم ہوا۔ ٹھہرا (ص۲۱)

مشہور امام و مجتہد وہب بن منبہ ذکر کرتا ہے کہ آدم زمین میں پیدا ہوئے اور اسی میں رہے اور یہیں اس کے لئے الفردوس بنائی گئی اور وہی الفردوس عدن میں تھی۔ (ص۲۱)

مسلمانوں کے بڑے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کوفی سے منذر بن سعید اپنی ایک کتاب میں روایت کرتا ہے کہ وہ جنت الخلد کو نہیں مانتے تھے۔ اور یہ منذر بن سعید امام صاحب کے دیگر مسائل میں سخت مخالف تھے۔ لیکن یہاں ان کا قول تائید میں نقل کیا ہے (ص۲۱)

مشہور فاضل امام ابومسلم اصفہانی جس کے پلّے کا مفسر نہیں گذرا اس نے اپنی تفسیر میں دلائل سے خلد کا انکار کیا ہے (ص۲۱)

مفسرین کے بلاتبصرہ نقل کرنے سے استدلال

(۱) علامہ ابومحمد بن عبدالحق بن عطیہ نے سورۃ بقرہ کی تفسیر میں قصۂ آدم کے ذیل میں دونوں قول نقل کئے ہیں۔ اسی طرح۔

(۲) مشہور مجتہد و امام ابومحمد بن حزم ظاہری نے الملل والنحل میں دونوں مسلک درج کرکے پھر ابن سعید القاضی کی رائے نقل کی ہے کہ اس کے نزدیک جنت دارِ مخلوق تو ہیں لیکن آدم و حوا جس جنت میں تھے وہ دوسری تھی (ص۲۱)

(۳) مفسر ابوعیسےٰ الرمانی نے اپنی تفسیر میں جنت الخلد کو اختیار کیا ہے لیکن مخالفین کی رائے بلاتبصرہ درج کی ہے۔

(۴) امام ابوالقاسم معروف امام راغب نے بھی دونوں قول نقل کئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ جنتِ آدم میں اختلاف ہے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے ایک بستان کو آدم کے امتحان کے لئے تیار کیا تھا اور وہ جنت الماوےٰ نہیں تھا۔ (ص۲۱)

(۵) عبداللہ ابن الخطیب الرازی نے اپنی تفسیر میں ایک تیسرا قول بھی نقل ہے یعنی توقف کرنا! کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جنت الخلد ہو اور ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔ کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ (ص۲۲)

(۶) امام ابوالحسن الماوردی فقیہ نے دونوں قول لکھے ہیں، اور کہ بعض مفسرین وثوق سے الخلد کا انکار کرتے ہیں اور دلیل لاتے ہیں کہ آدم کی جنت میں سورج اور چاند طلوع ہوتے تھے اور ابتداءً ابلیس بھی رہتا تھا۔ پس اگر وہ جنت الخلد ہوتی تو ابلیس نہ نکالا جاتا اور سورج چاند طلوع نہ ہوتے۔ (ص۲۲)

(۷) امام خطیب۔ فقیہ ابوالقاسم البلخی اور ابومسلم اصفہانی سے نقل کرتا ہے کہ ان کے نزدیک آدم کی جنت زمین پر تھی اور وہ اہباط کا ترجمہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر کوچ کرجانا کرتے تھے جیسا کہ بنی اسرائیل کو کہا گیا اھبطوا مصرا (بقرہ ۶۱) (ص۲۳) یعنی بنی اسرائیل آسمان پر تو تھے نہیں جنہیں نیچے اترنے کا حکم دیا گیا ہو۔

(۸) امام خطیب چوتھا مذہب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ سب احتمالات ہیں جو ممکن ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ نقلی دلائل (غالباً خلد کے ثبوت میں) سب کے سب ضعیف ہیں اور باہم متعارض۔ لہٰذا بجائے وثوق کے توقف کرنا بہتر ہے۔ (ص۲۲)

تفصیلی گفتگو

اعتراض:۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حذیفہؓ سے روایت ہے کہ حشر کے روز تمام مخلوقات آدم کے پاس جمع ہو کر مطالبہ کریں گی کہ وہ ابوالبشر ہونے کی وجہ سے جنت کا دروازہ کھولیں تب حضرت آدم جواب دیں گے کہ میری خطا تو جنت سے نکالا تھا اب میں کس طرح دروازہ کھولوں؟ تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ وہی جنت الخلد ہوگی جس سے آدم پہلے نکالے گئے تھے۔

جواب:۔ اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جنت اسم جنس ہے پس ہر بستان کو جنت کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات (قلم ۱۷) (اسرا ۹۱) (بقرہ ۲۶۵) اور (کہف ۳۲) ان آیات میں الجنۃ سے بستان یا مطلق باغات مراد ہیں۔ اب رہا آدم کا انکار تو دراصل انھوں نے پہل کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ بغیر اذنِ رب وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جنت ارضی میں ارتکاب جرم کا حوالہ دے کر جنت الخلد کے افتتاح کے معاملہ کو ٹالدیا۔ (ص۲۳)

اعتراض:۔ کلام حکیم میں اھبطوا کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت الخلد میں تھے اور اسی سے نکالے گئے۔ کیونکہ ھبوط ہوتا ہی بلندی سے نیچے کی طرف ہے۔

جواب:۔ (الف) یہ ادبیات عرب کے خلاف ہے ؎

ان تھبطن بلادقو × ہم یرتعون من الطلح

یہاں ھبوط کا استعمال کسی قوم کے گاؤں یا شہر میں پہنچنے پر ہوا ہے۔ یعنی سفر کی انتہا کو ہبوط کہا جاتا ہے۔ علاوہ (ب) ہبوط سے یہ کب ثابت ہوا کہ آدم کی جنت تھی ہی آسمان کی طرف؟ بلکہ اونچی زمین و پہاڑی سے بھی ہبوط ہی ہوتا ہے۔ جیسے محاورہ ہے کہ یھبط الحجر من اعلی الجبل الی اسفلہ (نحوہ) یعنی پہاڑ کی چوٹی سے پتھر لڑھک پڑا۔ (ص۲۳)

اعتراض:۔ آیہ ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین (بقرہ ۳۶) سے مترشح ہوتا ہے کہ آدم جنت الخلد میں تھے۔ بعد میں زمینی زندگی پر مجبور کئے گئے۔

جواب:۔ آپ کا یہ استدلال مفید مدعا نہیں (الف) صانع کائنات نے زمین کو کئی خطوں میں تقسیم کیا ہے۔ بعض سرد و گرم۔ بعض سرسبز و شاداب اور بعض بنجر و غیر آباد۔ کئی علاقے تمام نعمتوں سے مالا مال اور کئی محروم!! یہ زمینی مزاج کا تفاوت۔ ہر شخص کو عقلاً و حساً مسلّم ہے۔ پس آدم کو ایسی ہی جنت سے نکال کر کسی دوسرے غیر مانوس و سخت علاقے میں رہنے پر مجبور کیا گیا تھا (ص۲۳) علاوہ اس آیت سے (ب) ثابت ہوا کہ آدم کی جنت زمین پر ہی تھی لیکن یہ یاد رہے کہ جنت الخلد کے لئے بھی زمین ہوگی۔ ملاحظہ ہو وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء (زمر ۷۴) یعنی جنتی کہیں گے کہ حمد اس ذات کبریا کا جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہمیں ایسی زمین کا وارث بنایا جس میں ہم اپنی مرضی کی جنت جہاں چاہیں بنا سکتے ہیں (ص۲۳)

اعتراض:- ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ (طہ - ۱۱۸) سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جنت الخلد میں تھے جہاں معاش ولباس کی شکایت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی؛

جواب:- یہ ایک مشروط وعدہ تھا۔ شرط یہ تھی کہ ولا تقربا ھذہ الشجرۃ یعنی اگر تم اس ممانعت کے پابند رہے تو اس کا صلہ یہ ہوگا کہ آخرت میں تمہارا مقام "الخلد" ہوگا۔ جہاں بھوک نہ بے لباسی کا ڈر ہی نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لباس اور روٹی الخلد میں سب سے بڑا انعام ہوں گے۔ پس چونکہ آدم سے اس شرط کی پابندی نہ ہو سکی۔ لہٰذا اپنا موعودہ حق کھو بیٹھا۔ (صـ۲۲ ہجرت ب) ان کا پہلا مستقر (مقام قرار) اس مخصوص زمینی الجنۃ میں تھا۔ بعد میں ابتلاء و امتحان کی زمین میں کوچ کرنے کا حکم ملا۔ کلام پاک کی دوسری آیت فیھا تحیون وفیھا تموتون ومنھا تخرجون (اعراف ۲۵) کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی تمہاری زندگی اور موت بلکہ دوبارہ خروج اسی ابتلائی زمین سے متعلق ہے (صـ۲۳)

اعتراض:- الجنۃ معرف باللام ہے جس سے مراد مخصوص الجنۃ ہے پس کسی دوسری جنت کا ماننا غلط ہے؟

جواب:- یہاں الجنۃ کا الف ولام عہد کے لئے ہے (یعنی جو چیز پہلے ذہن میں ہو اس کی طرف مکرر ذہن کو منتقل کرنا) لیکن یہی عہد اللہ سبحانہ کے الفاظ میں آدم وحوا سے ایسی جنت سے متعلق ہے جس میں وہ رہ رہے تھے کیونکہ ان کے ذہن میں تو کوئی دوسری جنت تھی ہی نہیں جس کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو جاتا۔ پس آدم وغیرہ کے لئے تو وہی جنت معہود ہو گئی لیکن ہمارے لئے معرف باللام ہے۔ یعنی مخصوص الجنۃ کیونکہ ہم نے الفردوس یا زمینی جنت سرے سے دیکھی ہی نہیں۔ لہٰذا ہمارا ذہن اسی مخصوص الجنۃ کی طرف منتقل کرنا الٰہی حکمت ہے۔ پس اس سے جنت ارضی کی نفی اور جنت الخلد کا اثبات بڑا تکلف ہے (صـ۲۷)

الزامی جوابات

(۱) یہ تو سب مانتے ہیں کہ ایسی مٹی جس کی کیچڑ میں بدبو پیدا ہو سکتی ہو آسمان پر اس کا پایا جانا محال ہے۔ کیونکہ وہاں ایسی مٹی جس میں تغیر، تعفن، فساد اور خشک و تر ہونے کی صلاحیت ہو۔ عقلاء کے نزدیک ناممکن ہے پس لامحالہ اسکی جگہ یہی متغیر و فاسد زمین ہی ہو سکتی ہے۔ (صـ۲۰)

(الف) بس اس کلیے کے مطابق بلا نزاع متفقہ و منصوص بات ہے کہ اللہ سبحانہ نے آدم کو زمین سے پیدا کیا اور اس کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ اس کے بعد اسے آسمان پر اٹھایا گیا؛ حالانکہ نعمت کے عمدہ انواع میں سے یہی اہم نوع یا انعام تھا لہٰذا جب کتاب و سنت میں ایک لفظ بھی آدم کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بارے میں نہیں ملتا تو معلوم ہوا کہ جس جنت میں وہ رہے تھے وہ آسمانی الخلد نہیں تھی (صـ۳۰) نیز:

(ب) اللہ سبحانہ نے کسی مخلوق کو عبث و بے کار پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ ایسا کرنا اس کی حکمت کے منافی ہے۔ اب اگر آدم کی تخلیق ایسی جگہ ہوئی جہاں سرے سے امر و نہی کے تکلیفات ہی نہیں تھے تو یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔ ارشاد ہے کہ ایحسب الانسان ان یترک سدیٰ (قیامت ۳۶) جس کی تفسیر امام شافعی فرماتے ہیں کہ معطلا لا یؤمر ولا ینھیٰ یعنی انسان بے کار محض پیدا نہیں ہوا جو امر و نہی کے قابل ہی نہ ہو؛ نیز یہ افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون (مؤمنون ۱۱۵) سے بھی اسی کی نفی ہوتی ہے

پس جب خدا نے کسی کو بے کار و عبث پیدا نہیں کیا اور سب یہ بھی مانتے ہیں کہ الخلد تمام تکلفات سے پاک ہے تو آدم کی جنت ایسی نہیں ہو سکتی جو امر و نہی کے تکلفات سے آزاد ہو۔ (ص۳۳)

(۲) اگر جنت آدم ایک لافانی مقام ہے اور اس کے بعض درختوں میں دائمی حیات بخشی کا معجزہ ہے تو اس کے تمام درخت ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ ان میں سے ایک درخت کو شجرۃ الخلد کہنا کیا معنے رکھتا ہے؟ (ص۳۴)

اجماع امت کا دعوےٰ

حافظ ابن القیم صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کا اتفاق نہ صحابہ سے ثابت ہے اور نہ تابعین و تبع تابعین سے نہ اصالتاً اور نہ بطریق شاذ اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مشہور ہوا کہ آدم اسی جنت الخلد میں تھے جو متقین کے لئے تیار کی جائے گی۔ (ص۳۳)

اور کس طرح ہو سکتا ہے جب کہ قاضی منذر بن سعید نے درجنوں علمائے سلف و ائمۂ اعلام سے جنت الخلد کا انکار نقل کر کے اجماع کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ حضرت امام اعظم و دیگر فقہا جن کی نقہہ کے بڑے ذخیرے موجود ہیں کوئی کم پائے کے علماء نہیں تھے۔ حضرت امام مالک کے استاد امام نافع تابعی جو ثقہ امام و محدث تھے ان سے جب سوال کیا گیا کہ جنت مخلوق ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ سکوت افضل ہے!! علماء کہتے ہیں کہ اگر آدم جنت الخلد میں ہوتے تو نافع سلف [illegible] کرتے؟ صاف کہدیتے کہ ہاں جنت الخلد مخلوق ہے (ص۳۳) پس ثابت ہوا کہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امت کا اس پر اتفاق ناممکن ہے۔

امام صاحب کا مشورہ

امام ابن القیم صاحب مشورہ دیتے ہیں کہ ان دلائل کی موجودگی میں کسی پر طعن و تشنیع کرنا بالکل نامناسب ہے اور ایسا کرنے سے مرض کی شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی غرض پوری ہوتی ہے۔ (ص۱۵) پھر جب دلائل سامنے ہوں تو انسان جو چاہے اختیار کرے لیکن اس کا حق یہ نہیں ہے کہ مسئلہ کا اختلاف مسلّم ہونے کے بعد بھی کسی ایک کو برا بھلا کہے بلکہ جب پہلوان میدان میں اتر چکے تو اس وقت مناسب ہے کہ درمیان سے نکل جائے ؎

اذا تلاقی الفحول فی لجب
فکیف حال الغصیص فی الوسط

(مفتاح دار السعادۃ طبع دوم ص۳۵)

استدراک

(۱) حضرت آدمؑ کے ذکر میں ان کی خطاء کا تذکرہ ہوا ہے۔ ہم انبیا کو خطا کار نہیں سمجھتے اور جن الفاظ قرآنی سے ایسا سمجھا جاتا ہے وہ ادبیات عرب سے ہٹ کر عقیدہ محض پر مبنی ہے اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں لیکن یہاں ہماری پوزیشن مترجم کی تھی۔ لہٰذا ہم نے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا۔ (والا قرآن کسی کے عقیدہ کا پابند نہیں ہے۔

(۲) اس مضمون سے متعلق شیخ الطائفہ محی الدین ابن عربی اور دیگر علماء کی رائے کو عمداً حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں جس شخصیت کے تاثرات کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں لہٰذا ان کے تاثر کو کسی کی رائے سے مخلوط نہیں کیا گیا لیکن فرصت نصیب اور قدرت یاور ہوئی تو الگ مضمون میں اسے بھی ترتیب دیا جائے گا۔

(۳) بعض اصطلاحی الفاظ کی تشریح نہ ہو سکی تو اس میں بھی وہی ترجمانی مجبوری تھی، لیکن اب مختصراً عرض ہے کہ

(الف) اسم جنس لفظ کے اعتبار سے تو مفرد ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اطلاق مفرد و جمع دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اور اپنے ضمن میں ہر چیز پر شامل ہوتا ہے۔ مثلاً الانسان او القوم کا لفظ ہے یہ لفظی اعتبار سے مفرد ہیں لیکن ان سے ایک فرد مراد نہیں ہے۔ اسی طرح الجنۃ اسم جنس ہے جو کہ لفظاً مفرد ہے مگر اس سے مراد کوئی مخصوص بستان نہیں ہے۔ یا مثلاً ہم گندم کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ ہے تو مفرد مگر جس طرح ایک دانے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح ہزار پر بھی۔ پھر صنا نت کے لحاظ سے اس میں عمدہ اور ردی بھی شامل ہے تو ادصاف کی رو سے سرخ و سپید بھی!!

(ب) الف ولام عہد، بہت سوں میں سے کسی ایک کو ذہن میں متعین کرنا اسے عہد کہتے ہیں۔ یعنی متکلم ایسا فقرہ استعمال کرے کہ سامع کے ذہن میں سنتے ہی اس کا متعین مفہوم آجائے۔ اور اس کا ذہن کسی طرف منتقل ہوئے بغیر معلوم مطلوب تک پہنچ جائے۔ اردو میں اس کی مثال یوں سمجھو کہ اقبال کا تذکرہ ہو رہا ہے اور نام لئے بغیر صرف حکیم الامت کا لفظ دہرا دیا جاتا ہے تو اس سے سامع کو یہ اشتباہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ اس سے مراد اشرف علی صاحب تھانوی ہیں۔ کیونکہ ذکر اقبال کا ہو رہا ہے اور ذہن میں اس کا حکیم الامت ہونا معلوم ہے تو اب یہ ناممکن ہے کہ اسے دھوکہ لگے!۔ اسی عہد کے لئے عربی گرائمر میں الف ولام کا لفظ ہے جو ہر کلمہ کی ابتدا میں لگا کر اس کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ مثلاً الوحی الروح۔ النکاح۔

(ج) معرف باللام ہر گرائمر میں دو قسم کے اسم ہوتے ہیں۔ معرفہ و نکرہ۔ معرفہ خاص اور نکرہ عام۔ عربی میں معرفہ بنانے کے اسباب میں اَلْ کا ابتدا میں لانا بھی ہے۔ مثلاً حمد کا لفظ ہے جو عام مدح و ثنا کو کہتے ہیں۔ لیکن الف لگانے سے یہ خاص ہو جاتا ہے۔ مثلاً الحمد جو صرف ذاتِ باری تعالےٰ کے لئے روا ہے۔

اللھم صل علی محمد وھو اول من اٰمن بالقرآن

ابلیس و آدم — از — پرویز

سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات۔ ملائکہ۔ دجی شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات — قیمت :۔ آٹھ روپے

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ

اُردو زبان میں نماز

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں عنوان بالا سے ایک مقالہ شائع کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ جو ایک نئی جدت پیدا کی جارہی ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جائے یا امام جو کچھ عربی زبان میں پڑھے ایک مترجم ساتھ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ باآواز بلند پکارتا چلا جائے، یہ مناسب نہیں۔ اس پر ہمیں اس جدت کے حامیوں کی طرف سے چند خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں انھوں نے اس پر زور دیا ہے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ ہم الگ الگ خطوط شائع کرنے کے بجائے ان کے اعتراضات کا جواب مجموعی طور پر عرض کرتے ہیں۔

(۲) ان تمام خطوط کی بنیاد اس اعتراض پر ہے کہ مسلمان جہلاء نماز کے الفاظ کو طوطے کی رٹتے رہتے ہیں۔ "اگر ان حالات پر نہایت نیک نیتی سے ایک جماعت اس بات کی کوشش کرنے لگی ہے کہ جہال کی ایک کثیر تعداد جماعت کو کم از کم عربی کی ان عبارتوں کے معانی و مطالب سے کچھ نہ کچھ آشنا کیا جائے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں تو جناب کے نزدیک یہ ایک ایسا جرم ہوگا جو ان تمام مزعومہ فوائد کو لے ڈوبے گا جن کے پیش نظر یہ جدت اختیار کی جارہی ہے"۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ یہ اعتراض طلوع اسلام کے مضمون کو بغور پڑھے بغیر محض غصہ میں آکر کر دیا گیا ہے۔ طلوع اسلام آج سے نہیں بیس برس سے مسلسل اور متواتر کہہ رہا ہے کہ قرآن کریم کو بے سمجھے بوجھے پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس کی اس قسم کی تلاوت سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔ الفاظ مطلب سمجھنے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ بے معنی دہرانے کے لئے۔ حتیٰ کہ وہ نماز بھی نماز نہیں ہوتی جس میں انسان مفہوم کو نہ سمجھے۔ ہم نے اپنے سابقہ مضمون میں اس کی پوری پوری صراحت کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات کہتے ہیں کہ طلوع اسلام اس کی مخالفت کر رہا ہے کہ جہلاء کو قرآن یا نماز کے معانی سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

برادران عزیز! طلوع اسلام اس کی مخالفت نہیں کر رہا کہ جہلاء کو نماز کا مفہوم کیوں بتایا جارہا ہے۔ وہ مخالفت کر رہا ہے اس طریقہ کی جس کی رو سے عوام کو نماز کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یعنی جو کچھ امام اونچی آواز سے کہے ایک شخص اس کا ترجمہ دہراتا چلا جائے۔ اس طریقہ کے نقائص کو ہم نے واضح طور پر بیان کیا تھا۔ اب انھیں پھر دہرایا جارہا ہے۔ یعنی

(۱) سب سے پہلے تو یہ کہ پانچ نمازوں میں دو رکعت صبح کی۔ دو مغرب کی اور دو عشاء کی ایسی ہیں جن میں قرأت باآواز بلند ہوتی ہے۔ باقی تمام رکعتوں میں (خواہ وہ فرضوں کی ہوں یا سنتوں اور نفلوں کی) امام اور مقتدی پوری نماز چپکے چپکے پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ

افہام و تفہیم مطالب کا یہ طریقہ صرف چھ رکعتوں میں کارفرما ہو سکتا ہے۔

(۲) نماز باجماعت میں بھی صرف سورۃ الحمد اور ایک دوسری سورت جہری پڑھی جاتی ہے۔ باقی ساری نماز خفی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طریقہ سے صرف سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک اور سورت کے مطالب ہی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ نماز میں جو کچھ اس کے علاوہ پڑھا جاتا ہے اس کے مطالب بیان کرنے کا موقع کبھی نہیں آ سکتا۔

اس کے بجائے اگر نماز شروع ہونے سے پہلے نمازیوں کو نماز کے معانی بتا دیئے جائیں تو غور کیجئے کہ یہ طریقہ مندرجہ بالا طریقہ سے بہتر ہے گا یا نہیں؟

(۳) اس جدت کے متعلق ہم نے سب سے بڑا خطرہ یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ایک اور فرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ نماز میں اختلاف مختلف فرقوں کا امتیازی نشان ہے۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ جب طلوع اسلام مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کو گوارا کر رہا ہے۔ تو ان میں اگر ایک اور فرقہ کا اضافہ ہو جائے گا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔

ان حضرات کو کون بتائے کہ طلوع اسلام موجودہ فرقوں کو اس لئے گوارا کر رہا ہے کہ اسے ان فرقوں کے مٹانے پر قدرت حاصل نہیں۔ اس کے نزدیک فرقہ پرستی شرک ہے۔ لہٰذا جب وہ دیکھے کہ اس شرک میں ایک نیا اضافہ ہو رہا ہے تو کیا اس کا اس کے خلاف آواز اٹھانا جرم ہے؟ حیرت ہے کہ لوگ غصہ میں کس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ مختلف فرقے جس جس انداز سے نماز پڑھ رہے ہیں پڑھتے رہیں تو پھر ایک اور قسم کی نماز پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے؟

طلوع اسلام مختلف فرقوں سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو باہمی جنگ و قتال کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اگر ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ خالص قرآن کی آواز کو اپنا کر اس فرقہ بندی کی لعنت سے بلند ہو جائیں تو کم از کم آپس میں امن چین سے تو رہیں تاآنکہ یہاں کبھی خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہو جائے جو ان فرقوں کی جگہ اسی طرح امت کو ملت واحدہ بنائے جس طرح یہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ایک نئی نماز اور نئے فرقے کے تصور سے طلوع اسلام کا دل کانپ اٹھا ہے۔

کے تو انم دید زاہد جام صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

(۴) ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم نے یہ عجیب بات لکھدی کہ قرآن کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا"! اس کے معنی ہیں کہ ہم کسی غیر مسلم کو جس کی زبان عربی نہ ہو قرآن سمجھا ہی نہیں سکتے"۔ ہائے اس بھائی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ جب ہم نے کہا تھا کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا (اور اسے اب ہم پھر دہراتے ہیں) کہ کسی ترجمہ میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو قرآن کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کا کوئی ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو بہت آگے کی چیز ہے کسی شعر کا

ترجمہ دوسری زبان میں کیجئے اس سے قطعاً وہ بات پیدا نہیں ہو سکیگی جو اصل شعر میں ہوتی ہے۔ گوئٹے کا "فاسٹ" شیکسپیئر کے "ہملٹ" نیٹشے کی کتاب "بقول زردشت" (حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے) کے مختلف زبانوں میں متعدد تراجم ہو چکے ہیں۔ لیکن جو لوگ ان کتابوں کی اصل زبان جانتے ہیں وہ ان ترجموں کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ جو بات اصل میں ہے وہ ان ترجموں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی صورت کلام اقبال کے انگریزی ترجموں کی ہے۔

یہ تھی وہ بات جو ہم نے کہی تھی اور اس کے لئے اس پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کی زبان ضرور سیکھنا چاہیئے۔ تاکہ وہ براہ راست قرآن تک پہنچ سکیں۔ البتہ دوسروں کے لئے قرآن کے تراجم ناگزیر ہیں کیونکہ انھیں ہم مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ عربی زبان سیکھیں ہم نے ان تک اسلام پہنچانا ہے اس لئے ہمیں بہرحال ان کی زبان میں ہی گفتگو کرنی ہوگی۔ اسی طرح جو مسلمان ہنوز عربی سے نابلد ہیں انھیں بھی قرآن کریم ترجمہ کے ذریعہ ہی سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بر سبیل تنزل ہی کیا جائے گا۔ یہ ترجمے اصل کی جگہ لے سکتے ہیں نہ ان سے وہ بات پیدا ہو سکتی ہے جو قرآن کے اصل الفاظ میں ہے۔

(۵) ایک صاحب نے لکھا ہے کہ یہ بات ہم نے "عربی زبان کے جھوٹے تقدس کی بنا" پر کہی ہے۔

ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم کسی زبان کے تقدس کے قائل نہیں۔ البتہ عربی زبان کی اہمیت کے ضرور قائل ہیں اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم (جسے ہم اپنی زندگی کا نصب العین کہتے ہیں) وہ عربی زبان میں ہے۔ اگر قرآن کریم چینی زبان میں ہوتا تو ہمارے نزدیک یہی اہمیت چینی زبان کو حاصل ہوتی۔

(۶) ایک صاحب نے طنزاً لکھا ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ جب ہم پنجابی زبان میں دعا مانگتے ہیں تو اللہ میاں ناراض ہو جاتا ہوگا۔

طنز کا تو ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ گذارش اتنی ہے کہ ہم نے کہیں نہیں لکھا کہ دعا بھی صرف عربی زبان میں مانگنی چاہیئے ہمارے نزدیک دعا انسان کی شدت آرزو کے اظہار کا نام ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اظہار اپنی زبان میں ہوگا (بجز اس کے کہ آپ عربی زبان یا کسی دوسری زبان پر اس حد تک قادر ہوں کہ آپ سوچنا بھی اسی زبان میں شروع کر دیں) اللہ میاں کے نزدیک ہر زبان برابر ہے۔ اسلئے وہ پنجابی زبان میں دعا مانگنے والے کو پھٹکارتا نہیں نہ ہی قرآن کے اردو ترجمے پر اسے غصہ آتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قرآن کے الفاظ کا بدل کسی اور زبان کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔

(۷) ایک صاحب نے لکھا ہے کہ طلوع اسلام نے اپنے خیال کی تائید مسلک حنفی سے کیوں کی؟

طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ پیش نظر کو خالص قرآن کی روشنی میں دیکھتا ہے اور وہاں سے جو جواب ملتا ہے اسی کو صحیح سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اگر اسے کسی مقام سے اس جواب کی تائید ملتی ہے تو وہ اسے درج کر دینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔

مسلک حنفی کے پیش کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اردو نماز کے حامیوں نے کہا تھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فارسی زبان میں نماز کی اجازت دی ہے۔ مذہب حنفی کے ایک قابل اعتماد ترجمان نے لکھا کہ ان لوگوں کا یہ دعوے غلط ہے۔ امام اعظمؒ نے اس خیال سے رجوع فرما لیا تھا اور حنفی مسلک یہ نہیں ہے۔ ہم نے اس لحاظ سے اس ٹکڑے کو شائع کرنا ضروری سمجھا کہ یہ ان حضرات کا جواب بھی

اور ہماری بصیرت کی رو سے قرآن کے مطابق بھی۔ اگر یہ تحقیق ہو جاتا کہ امام اعظم رح یا کوئی اور امام یا بزرگ کسی ترجمہ کو قرآن کا بدل سمجھ کر قرآن کی جگہ نماز میں پڑھنے کے قایل تھے تو ہم بلا توقف کہہ دیتے کہ ان کا یہ مسلک قرآن کے خلاف ہے۔

(۴) ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ہمارے بچے پہلے ہی کئی زبانیں سیکھنے کے بوجھ تلے مر رہے ہیں۔ اب آپ نے اس میں ایک اور زبان (عربی) کا بھی اضافہ کر دیا؟

ہمیں اپنے بچوں سے ہمدردی تو ضرور ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم انھیں بار بار یہ بتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا ارمان ہے کہ قرآن کریم ان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کتاب کسی کے لئے زندگی کا ضابطہ ہو اس کتاب کا سمجھنا لاینفک ہے۔ اور قرآن کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کا جاننا بہرحال ضروری ہے۔ ہم قریب ایک سو سال سے محض دنیا کی خاطر انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں (اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی زبان وسعت معلومات کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن ہم اسے بنیادی طور پر روٹی کمانے کی خاطر ہی سیکھتے ہیں) اگر ہم ایمان کو روٹی جتنی بھی اہمیت دیں تو عربی زبان کو انگریزی جتنی حیثیت تو دینی پڑے گی۔ یہ حکومت کا کام تھا کہ وہ ہمارے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی کر دے جس سے ہمارے بچے بے معنی بوجھ سے نجات حاصل کریں اور ساتھ ساتھ عربی زبان بھی سیکھتے جائیں۔

اس مقام پر اتنا اضافہ بے محل نہیں ہوگا کہ ہمارے موجودہ مکتبی طریق تعلیم نے عربی زبان کو ہوا بنا رکھا ہے۔ ورنہ اگر اسے ذرا بھی سائنٹفک طریق سے سیکھا جائے تو یہ ایسی مشکل زبان ثابت نہیں ہوگی۔ آج کل خود مرکزی بزم طلوع اسلام کی زیر نگرانی جو تجربہ کیا جا رہا ہے وہ اس کی زندہ شہادت ہے۔ ہم نے جو عربی کلاس جاری کر رکھی ہے وہ اردو یا انگریزی جاننے والے بالغوں پر مشتمل ہے۔ اسے جاری کئے ہوئے بمشکل تین مہینے ہوئے ہیں اور ہفتہ میں ایک ایک گھنٹہ کے صرف دو لیکچر ہوتے ہیں۔ لیکن اتنے قلیل وقت میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ یہ طالب علم قرآنی آیات کی تراکیب کو سمجھنے لگ گئے ہیں اور ان کا اردو میں ترجمہ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس تجربہ کو کتابی صورت میں مدون کر کے اس کی عام اشاعت کر دی جائے۔

ہماری اس نئی جماعت کو نماز کا مفہوم سمجھانے کے لئے کوئی اس قسم کی کوشش کرنی چاہیئے تھی نہ کہ عربی اردو کی مخلوط نماز کی جدت سے۔

یہ تو تھے معترضین۔ لیکن ان کے علاوہ کراچی کے ایک دوست نے محض سمجھنے کی خاطر یہ دریافت کیا ہے کہ

جب ہم قرآن کریم کے عربی کے الفاظ سنتے یا بولتے ہیں تو ان کا مفہوم ہمارے ذہن میں ہماری اپنی زبان (اردو) ہی میں آتا ہے۔ اس لئے قرآن کے اصل (عربی) الفاظ کے سننے یا بولنے پر اصرار کرنے سے کیا مطلب ہوا؟

جواب اس میں شبہ نہیں کہ آیات قرآنی کا مفہوم ہمارے ذہن میں ہماری اپنی زبان ہی میں آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، قرآن کے اپنے الفاظ کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ غور سے سنئے۔

پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی کچھ آیات ایسی ہیں جن میں احکامات دیئے گئے ہیں۔ احکامات کا مفہوم متعین ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ وضو میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے چاہئیں تو اس سے ایک متعین مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیات وہ ہیں جو حقائق و شواہد کائنات سے متعلق ہیں یا جن میں احکامات کی حکمت اور غایت بیان کی گئی ہے۔ اس قسم کی آیات کا انداز یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم و تحقیق کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے ان کے مفہوم میں بھی وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے مفہوم کی وسعت اور گہرائی نکھر کر سامنے آتی جاتی ہے۔ قرآن کے اپنے الفاظ میں تو اتنی وسعت ہے کہ زمانے کی علمی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ ان میں پھیلاؤ پیدا ہوتا جائے۔ لیکن ترجمہ میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) اُردو کے جو ترجمے آج سے سو سال پہلے ہوئے ہیں اُن سے آج کچھ مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہمارے زمانے کی علمی سطح اُس زمانے سے کہیں اونچی ہو چکی ہے اور ترجمے کے الفاظ اپنے مقام پر جامد ہیں۔ لہٰذا، اگر آج کے مخاطبین کے سامنے (قرآن کے الفاظ کے بجائے) سو سال کے پہلے کا ترجمہ پیش کیا جائے تو اس سے قرآن کا مفہوم سامنے نہیں آسکے گا۔

اب ایک قدم آگے چلئے۔ یہ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ جو فہم بیس سال کی عمر میں ہماری تسکین کر دیتا تھا وہ چالیس سال کی عمر میں نہیں کرتا (بشرطیکہ ہم اپنی عمر کے ساتھ ساتھ علمی طور پر آگے بڑھتے رہیں)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر آج ہمارے سامنے (قرآن کے الفاظ کے بجائے) قرآن کا وہ مفہوم پیش کر دیا جائے جو آج سے بیس سال پہلے ہمارے لئے وجہ طمانیت تھا، تو وہ مفہوم ہمارے دل پر وہ اثر قطعاً پیدا نہیں کرے گا جو اس مفہوم سے مرتب ہوگا جسے ہم آج متعین کریں۔ لہٰذا زمانے کے بدلنے ہی سے نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر کی مختلف منازل میں بھی، ایک ہی مفہوم کام نہیں دے سکتا۔

اب اور آگے بڑھئے۔ ایک اجتماع میں امام (یا مکبر) قرآنی آیات کا کوئی ترجمہ (یا مفہوم) بیان کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں تمام حاضرین ایک ہی ذہنی سطح کے نہیں ہیں۔ مختلف لوگوں کی ذہنی سطح مختلف ہوگی۔ لہٰذا، اس اجتماع میں پیش کردہ مفہوم، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہے کہ وہ چند لوگوں کے لئے وجہ اطمینان بن سکے سب کے لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے اگر قرآن کے اصل الفاظ سامنے لائے جائیں تو ہر شخص اپنی اپنی ذہنی سطح اور علمی وسعت اور بلندی کے مطابق ان کا مفہوم متعین کر لے گا اور اس طرح ایک ہی آیت تمام افراد کے لئے وجہ اطمینان ہو جائے گی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگرچہ ہم قرآنی الفاظ کا مفہوم اپنے ذہن میں اپنی زبان میں لاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے قرآن کے اصل الفاظ آئیں نہ کہ کسی دوسری زبان میں ان کا ترجمہ یا مفہوم۔ قرآنی الفاظ کا اعجاز یہ ہے کہ ان میں بے انتہا وسعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب جہاں آج سے چودہ سو سال پہلے صحرانشین اور بادیہ پیمایوں کے لئے وجہ طمانیت قلب بنتی تھی۔ وہاں اس بیسویں صدی میں، گب اور ایڈنگٹن جیسے ائمہ علوم و تحقیق کے لئے بھی باعث تسکین ثابت ہوتی ہے اگر یہ کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ نہ رہتی اور اس کے صرف تراجم ہم تک پہنچتے تو دنیا کی دوسری مذہبی کتابوں کی طرح

(جن کے صرف تراجم موجود ہیں) دنیائے علم و تحقیق میں اس کی وہ عظمت کبھی باقی نہ رہتی جو آج ہر صاحب بصیرت کو وجد میں لے آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے تراجم بلامتن چھاپنے کے بھی اس قدر مخالف ہیں۔ قرآن اپنے الفاظ میں قرآن ہے اور کوئی ترجمہ یا مفہوم اس کے الفاظ کا بدل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ تھے وہ اعتراضات یا استفسارات جو اس ضمن میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ہم ان کے اطمینان بخش جواب عرض کر سکیں۔ لیکن اگر اس کے باوجود کوئی بات تشنۂ تکمیل رہ گئی ہو تو ہم اس کی مزید وضاحت کی بھی کوشش کریں گے۔

جوئے نور

کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ قیمت چھ روپے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ـــــ کراچی ۲۹

تفسیر بیان القرآن

یہ تفسیر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی نادر تالیف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان کی موجودہ تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں تو قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ حقیقتاً یہ تفسیر اور ترجمہ قرآن پاک ہر مسلمان کے پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ (نمونے کے صفحے مفت منگوا کر ملاحظہ فرمائیے)

تاج کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵۳۰ کراچی

مشرقی ممالک میں قانون سازی کی تحریک

ڈاکٹر صبحی محمصانی - بیروت

[اس وقت پاکستان کے سامنے سب سے اہم سوال مملکت کے لئے ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کا ہے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے ایک قانون کمیشن مقرر ہونے والا ہے۔ اس سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے سابقہ ماہ ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک اہم مقالہ ڈاکٹر صبحی محمصانی کا بھی ہے جو بیروت کی عدالتِ مرافعہ کے صدر اور فن تقنین کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ذیل میں ان کا ایک اور مضمون شائع کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے مختلف ممالک میں قانون سازی کے سلسلہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ مضمون دراصل ڈاکٹر صاحب کی کتاب فلسفۃ التشریع فی الاسلام کے ایک باب پر مشتمل ہے جس کا اردو ترجمہ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب (یعنی اصل کتاب) کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں (جب پاکستان معرضِ وجود میں آچکا تھا) ہم نے اس مقالہ سے غیر متعلقہ حصے حذف کر دیئے ہیں۔

مقالہ کا افتتاح مجلۃ الاحکام العدلیہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ مجموعۂ قوانین ہے جو خلافتِ عثمانیہ کے زمانہ میں ترکی میں مرتب ہوا تھا (اسکی تکمیل ۱۸۷۶ء میں ہوئی تھی) اس میں اکثر احکام و مسائل مذہب حنفی کی ظاہر الروایۃ کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

اس تمہیدی تعارف کے بعد آپ اصل مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ طلوع اسلام]

موجودہ زمانے میں مجلّہ کی حیثیت

جب عرب ممالک میں قانون سازی کی عام تحریک شروع ہوگئی تو مجلۃ الاحکام العدلیہ، ترکی اور ان ممالک میں جو حکومت عثمانی کے زیر اثر تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تک بحیثیت دستور اصل قائم رہا اس کے بعد ترکی میں بالکل منسوخ ہوگیا۔ پھر اسوا چند مسائل کے لبنان میں بھی آہستہ آہستہ منسوخ ہوگیا اور آجکل ترمیم شدہ صورت میں

صرف فلسطین عراق۔ سوریا اور شرق اردن میں باقی ہے۔[1]

اس موقع پر عراق کے جدید مسودۂ قانون مدنی کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں بغداد میں ایک مجلس قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس مسودۂ قانون کو فقہ اسلامی کے اصولوں پر ڈھالا جائے اور اس میں حالات جدیدہ کے تقاضوں کے لحاظ سے زمانۂ حاضرہ کے کچھ نئے قوانین بھی شامل کئے جائیں۔ چنانچہ مجلس نے مصر کے مشاہیر علمائے فقہ میں سے ڈاکٹر سنہوری کو جدید قانون کا ایک حصہ وضع کرنے کے لئے مقرر کیا۔ جب انھوں نے جدید قانون کا ایک حصہ وضع کر لیا تو کچھ عرصہ توقف کیا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں کام شروع کر کے قانون سازی کا کام مکمل کر لیا۔ آج کل وہ مسودۂ قانون ڈاکٹر سنہوری کی قیادت -- اور ماہرین قانون کی نگرانی میں مجلس کے زیر غور ہے۔ جب مجلس اپنی بحث و تمحیص مکمل کر لے گی تو اسے منظوری کے لئے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔[2]

اب ہم بڑے بڑے اسلامی اور عربی ملکوں کی قانون سازی کا کچھ مختصر سا حال بیان کرتے ہیں۔

پاکستان در ہند

برطانوی ہند میں تقسیم ملک سے پہلے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق چالیس کروڑ کی کل آبادی میں سے تقریباً ساڑھے نو کروڑ مسلمان تھے۔[3] بنگال۔ پنجاب اور کشمیر کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اکثر حنفی المذہب ہیں۔ اس کے بعد سلفی۔ پھر شیعہ[4]، پھر شافعی۔

برطانیہ کی پالیسی ابتداء سے یہ رہی کہ اہل ہند کی قومی رسومات اور مذہبی قوانین میں کبھی دخل نہیں دیا۔ چنانچہ اس نے ۱۷۷۲ء میں ایک قانون بنا کر اعلان کیا کہ مسلمانوں کا دستور العمل تمام معاملات وراثت۔ بیاہ شادی۔ رسومات قومی اور فرقہ وارانہ مسائل میں قرآنی شریعت کے مطابق ہوگا۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جج اور وکلا مسلمانوں کے مقدمات میں شریعت اسلامی اور فقہ کی عربی کتابوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ چنانچہ ان کے ہاں فقہ حنفی کی کتاب الہدایہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پھر فتاویٰ عالمگیریہ اور سراجیہ[5] وغیرہ نے۔ اسی طرح فقہ جعفری میں کتاب شرائع الاسلام مشہور ہوئی۔

---

[1] مثلاً شرق اردن میں مجلہ شروع سے اب تک دستور العمل چلا آتا ہے مع قانون المحاکمات الحقوقیہ کی دفعہ ۱۴ کے اور دوسری ترمیمات کے جیسے مسودۂ قانون ترمیم گواہان ۱۹۳۸ء جس کی رو سے ایک جج گواہی کی چھان بین کرنے اور اس کی قرار واقعی حیثیت معلوم کرنے کا مجاز ہے (مطبوعہ سرکاری اخبار نمبر ۲۱۱ مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۳۸ء) [2] ان معلومات کے لئے ہم ڈاکٹر سنہوری کے ممنون ہیں۔

[3] دیکھو ولفرڈ اسمتھ صاحب کی کتاب Modern Islam in India مطبوعہ لندن ۱۹۴۶ء، صفحہ ۵۸۔

[4] شیعی لوگ پاکستان اور ہندوستان کی کل مسلمان آبادی کا تیرھواں حصہ ہیں۔

[5] سراجیہ سراج محمد سجاوندی کی تالیف ہے جو چھٹی صدی ہجری کے علماء فقہ میں سے ہیں۔ یہ کتاب فرائض اور میراث کے مسائل میں مشہور ہے اسی طرح اس کی شرح شریفیہ تالیف سید شریف جرجانی مشہور ہے۔

کتب مذکورہ میں سے بعض کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا۔ ہملٹن (Hamilton) نے ۱۷۹۱ء میں ہدایہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اور سر ولیم جونز (Sir William Jones) نے ۱۷۹۲ء میں سراجیہ کا ترجمہ کیا۔ اور بیلی (Boille) نے فتاویٰ عالمگیری کے بعض ابواب کا اور شرائع اسلام کے اکثر حصہ کا ترجمہ کیا۔[۳]

انیسویں صدی کے نصف تک یہی کیفیت رہی۔ اسی صدی میں حکومت برطانیہ نے قانون سازی کا کام شروع کیا۔ اور چند قوانین بنائے۔ جیسے ۱۸۴۳ء میں تنسیخ غلامی کا قانون۔ اور قانون فوجداری اور قانون اساسی عدالت ہائے فوجداری۔ یہ دونوں قانون ۱۸۶۲ء میں جاری ہوئے۔ قانون گواہان ہندی ۱۸۷۲ء میں۔ قانون اوقاف ۱۹۱۳ء میں اور مسلمانوں کا قانون شریعت ۱۹۳۷ء میں بنائے گئے وغیرہا۔[۴]

الغرض ہندوستان میں قانون سازی کی یہ حالت تھی جو اوپر بیان کی گئی۔ ان قانونی ترمیموں کے سوا جو حکومت نے کیں۔ مسلمانوں پر ہمیشہ اسلامی قانون نافذ رہا۔ ان کے شخصی حالات میں تو قانون شرعی اور حق شفعہ وغیرہ معاملات میں قانون عرفی اور رسمی کا نفاذ رہا۔ مگر تمام صورتوں میں جج و مجسٹریٹ شرعی قوانین نافذ کرتے وقت فقہاء کے اقوال اور ان کے فتاویٰ کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ انگریزی قانون اور معاشرۂ جدیدہ کے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر شرعی احکام کی تشریح میں اپنے مفید مطلب گنجائش پیدا کر لیتے ہیں۔[۵]

آخر میں ہم سر سید احمد خاں بہادر (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے مسلمانان ہند کی اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی جس نے بعد ازاں ۱۹۲۰ء میں جامعہ اسلامیہ کی صورت اختیار کی۔ ان کے بعد اسلامی ہند میں ذہنی بیداری پیدا کرنے والوں میں سے مشہور جج سید امیر علی بھی ہیں۔ جن کا زمانہ حیات ۱۸۴۹ء سے لے کر ۱۹۲۸ء تک ہے۔ انھوں نے انگریزی زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے زیادہ مشہور "اسپرٹ آف اسلام"[۶] اور "محمڈن لا"[۷] ہیں۔

۱۔ لندن میں چار حصوں میں طبع ہوئی۔ پھر ۱۹۲۰ء میں دوبارہ طبع ہوئی۔

۲۔ Indian Evidence Act. ۳۔ Baillie, Digest of Mohammadan Law.

۴۔ ویلسن جامع الشریعۃ المحمدیہ الانگلیز Digest of Anglo-Mohammadan Law مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴ و ۲۱۔ ۴۸۔ ۵۔ Shariat Act, 1937. (دیکھو کتاب مبادی الشریعۃ المحمدیہ۔ تالیف ملا Principles of Mohammadan Law) کلکتہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۳۔ اور اس کے بعد۔

۶۔ عبدالرحیم، الشریعۃ المحمدیہ (Mohammadan Jurisprudence) مطبوعہ مدراس ۱۹۱۱ء۔ صفحہ ۴۲۔ ۴۴۔

۷۔ The Spirit of Islam (1891) ۸۔ Mohammadan Law (دو حصوں میں پہلی بار ۱۸۹۲ء ۹۳ء میں کلکتہ میں طبع ہوئی۔ پھر دوبارہ طبع ہوئی اور دوسرا حصہ ۱۹۲۲ء میں پانچویں بار طبع ہوا۔

انہی مفکرین میں سے مشہور شاعر شیخ محمد اقبال (۱۸۷۶ء - ۱۹۳۸ء) ہیں جو گذشتہ اجتماعی اور سیاسی انقلاب کے بانی مبانی ہیں۔ ان تمام لوگوں نے اجتماعی اصلاح کی آواز بلند کی۔ اندھی تقلید کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شریعت کی اصل روح اور اس کے دیموقراطی اصول کی طرف رجوع کریں۔[1]

اس امر میں کچھ شک نہیں کہ اس علمی اور اصلاحی بیداری سے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اس سیاسی تحریک کو بڑی امداد ملی جسے قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے ایک مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کے لئے جاری کیا۔ اس تحریک سے وہ انقلاب پیدا ہوا جس سے ہندوستان دو سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا۔ پہلی سلطنت میں جس کا نام بھارت یا ہندوستان یا ہند ہے ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ دوسری سلطنت پاکستان ہے جس میں آٹھ کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ لوگ بستے ہیں اور ان میں سے اکثر مسلمان ہیں۔ پاکستان کے دو حصے ہیں مغربی اور مشرقی۔ مغربی حصے میں سندھ بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور ریاست بہاولپور وغیرہ شامل ہیں۔ مشرقی پاکستان مشرقی بنگال پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہندوستان کا وسیع ملک واقع ہے کشمیر کا ملک تاحال ان دونوں مملکتوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہے۔[2]

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک مستقل سلطنت کی حیثیت سے معرض وجود میں آیا اور اگلے دن اس بات کا اعلان ہوا کہ وہ ایک (dominion) ہے اور برٹش کامن ویلتھ کا ایک حصہ ہے۔ پاکستان کے دستور اور نظام حکومت کی تشکیل کے لئے ایک (Constituent Assembly) قائم ہے۔ اس اسمبلی نے قرارداد کے ذریعہ دستور کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا اور دیموقراطی اصول یعنی حریت، مساوات، رواداری اور اجتماعی عدالت کو بطور دستور العمل کے تسلیم کیا۔[3]

انڈونیشیا پاکستان کی آزادی کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈچ ایسٹ انڈیز کے جزائر کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم جاوا اور سماٹرا ہیں۔ ان جزائر کے اہالی نے بتاریخ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء جمہوریہ انڈونیشیا کے نام سے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور پھر بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء ہیگ کانفرنس نے جمہوریہ ولایات متحدہ انڈونیشیا کے نام سے ان کی آزادی کو تسلیم کیا۔ اس جمہوریہ کے باشندوں کی تعداد ساڑھے سات کروڑ کے قریب ہے جن میں سے اکثر مسلمان ہیں اور شافعی مذہب کے پیرو ہیں۔ مقامی رسم و رواج کے ساتھ ساتھ وہاں شریعت اسلامی کے بعض احکام نافذ ہیں۔ خصوصاً شخصی اور ذاتی معاملات میں۔

---

[1] دیکھو ولفرڈ اسمتھ کی کتاب مذکورہ ص ۱۵، ۴۸، ۱۹۸ اور

The Making of Pakistan by R.Simonds, London, 1949.

[2] مشرقی پاکستان کا رقبہ کل پاکستان کے رقبہ کا پندرہ فیصدی ہے۔ مگر وہاں کی کل آبادی کا ۵۰ فیصدی ہے۔

[3] اس اسمبلی نے پاکستان کا آئین منظور کر دیا تھا اور اب اس کے مطابق یہاں الیکشن کا تقرر ہو رہا ہے۔

مصر مصر کی آبادی تقریباً دو کروڑ ہے جو اکثر مسلمان ہیں اور جن میں اکثریت شافعی مذہب والوں کی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے کیونکہ امام شافعی نے اپنے مذہب کی اشاعت یہیں کی تھی۔

حکومت اسماعیلیہ (فاطمیہ) کے عہد تک محکمۂ عدالت کا مذہب بھی شافعی تھا۔ پھر حکومت اسماعیلیہ کے زوال کے بعد حکومت ایوبیہ کا مذہب بھی ظاہر بیبرس کے عہد تک شافعی رہا۔ مگر ظاہر بیبرس نے چار جج مقرر کئے۔ شافعی۔ مالکی۔ حنفی۔ اور حنبلی۔ ان میں سے شافعی قاضی کو امتیاز خصوصی حاصل تھا۔ فتح عثمانی کے بعد تک یہی کیفیت رہی۔ مگر بعد میں محکمۂ عدالت کا مذہب حنفی ہو گیا اور وہی مصر کی عدالتوں میں آج تک رائج چلا جاتا ہے۔

عثمانی دور کے آغاز میں مصر کی انتظامی عدالتوں کی تشکیل ہوئی اور شرعی فیصلوں کا دائرہ محدود ہو گیا۔ اس موقع پر حکومت مصر نے سیاسی اسباب کی بنا پر مجلۃ الاحکام العدلیہ کو ملک کا دستور العمل نہ بنایا۔ اسماعیل پاشا کے عہد حکومت میں فرمان خدیوی کے مطابق جو ۱۲ ربیع الاول ۱۲۹۱ھ (مطابق ۱۸۷۴ء) کو صادر ہوا۔ عدالتی اور انتظام ملکی کے لحاظ سے مصر پورے طور پر آزاد ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۸۷۵ء میں غیر ملکیوں کے مقدموں پر غور کرنے کو مخلوط عدالتیں قائم ہوئیں۔ اور ان کے لئے مخلوط قانون مدنی ۱۸۷۵ء میں جاری ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں عدالت ہائے ملکی کی دوبارہ تنظیم ہوئی اور ملکی قانون مدنی جاری ہوا۔ اس کے بعد مخلوط قوانین اور قوانین وطنیت جاری ہوئے۔ نیز شرعی عدالتوں کو ترتیب دینے اور انہیں شخصی حالات کے ساتھ مخصوص کرنے کے لئے کئی قواعد و ضوابط جاری ہوئے [1]

اس کے علاوہ حکومت مصر نے حنفی مذہب کے مطابق شخصی حالات کے شرعی احکام کی تدوین کا کام محمد قدری پاشا مرحوم کے سپرد کیا۔ چنانچہ انہوں نے ۶۴۷ دفعات کی ایک کتاب مرتب کی جس میں نکاح، طلاق، اولاد، نابالغ کی سرپرستی، حجر، رد کنا، ہبہ، وصیت اور میراث کے مسائل درج کئے اور وہ مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کی شرعی عدالتوں میں مستند کتاب قرار پائی۔

پہلے مصر میں ضابطۂ تنظیم عدالت ہائے شرعیہ مجریہ ۱۹۱۰ء کی دفعات ۲۸۰ کی رو سے امام ابو حنیفہ کے مفتی بہ اقوال پر عملدرآمد ہوتا تھا مگر بعد میں قانون نمبر ۲۵ مجریہ ۱۹۲۰ء کی رو سے دفعہ مذکور میں ترمیم کر دی گئی اور نان و نفقہ، عدت اور گمشدہ جیسے خاص مسائل میں امام مالک اور امام شافعی وغیرہا کے مذہب کے مطابق عملدرآمد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہاں مصر کے قانون میراث مجریہ ۶ اگست ۱۹۴۳ء کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے [2]

---

[1] دیکھو کتاب گوڈبی (Coadby's Introduction to the Study of Law) مطبوعہ لندن ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۶۲ اور اس کے بعد) اور دیکھو تاریخ القضاء فی الاسلام" تالیف جناب عرنوس (صفحہ ۱۰۳ - ۱۱۱ اور صفحہ ۱۹۷ اور اس کے بعد)

[2] یہ قانون نمبر ۷۷ ہے سرکاری اخبار نمبر ۹۲ مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۴۳ء میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ قانون مشتہر کرنے کی تاریخ سے چار ماہ بعد نافذ ہوگا۔ اس قانون میں ۴۸ دفعات ہیں۔

مصر میں بھی جدید اصلاحی تحریک جاری تھی۔ جو تحریک سلفیہ یا مذہب سلف الصالح کی تحریک کہلاتی ہے۔ یہ تحریک سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء) اور ان کے بعد ان کے شاگرد استاد امام شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء) مفتی مصر نے جاری کی تھی اور اس تحریک کے مبادیات اور اصول کی اشاعت کتابوں، لیکچروں اور مقالوں کے ذریعہ کی گئی۔ ان میں سب سے اہم سید محمد رشید رضا کا وہ رسالہ ہے جو قاہرہ سے ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا۔

تحریک سلفیہ

مذہب سلفیہ کا نصب العین یہ ہے کہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے اور جمود اور خرافات اور مخالف دین بدعتوں اور ہر اندھی تقلید کے خلاف جہاد کیا جائے وہ استدلال کرتے ہیں کہ قوم کے ان مقلدین کے ذریعہ جو غیر کے طریقوں کو اپنا لیتے ہیں۔ قوم کے دشمنوں کو قوم کی تخریب و بربادی کا راستہ مل جاتا ہے اور مقلدین کی عقل و فراست دوستات اور توہمات کی آماجگاہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مقلدین اپنے ائمہ کی تعظیم و تکریم کرنے اور غیر مقلدین سے نفرت کے باعث اپنے ابنائے قوم کے لئے ایک مصیبت بن جاتے ہیں۔ کیونکہ عقیدہ تقلید کی وجہ سے وہ ان کے مذہب اور ان کی ہر نقل و حرکت کو بہ نگاہ حقارت دیکھتے ہیں[۲]۔

یہی وجہ ہے کہ آپ مذہب سلفیہ کو وہابی اور جدید حنبلی مذہب سے زیادہ قریب پائیں گے[۳]۔ اس لئے کہ ہر دو مذہب اس حقیقی شریعت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو قرآن کریم اور احادیث صحیحہ پر مبنی ہے اور اسی اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ جس کی بنیاد اس اساس پر ہو۔ وہ جمود پسند فقہائے مقلدین کی رائے کی پابندی کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

انہی اصول کی بناء پر مذہب سلفیہ کے لوگ اسلام کے مختلف مذاہب کا اتحاد چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی اسلامی فرقہ ایک مذہب کے مقلدین کی تقلید کا بار برداشت نہیں کر سکتا اور نہ وہ اپنے امور خانہ داری اور مالی معاملات کی فلاح و بہبود کو ہر حالت میں صرف ایک مذہب کی کتابوں سے وابستہ کرنا پسند کرے گا[۴]۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف اسی طرح شریعت اسلامی عصر جدید کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ بہت سے معاملات تجارت میں عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق جواز کا فتوے دیتے ہیں۔ کیونکہ جب عقل اور نقل کا اختلاف ہو جائے تو عقلی فیصلہ پر عمل کیا جائے گا[۵]۔ یہ اصول ابن تیمیہ کے اس اصول کے مطابق ہے کہ شریعت اسلامی کی صحیح روایت ہمیشہ عقلی فیصلہ کے مطابق ہوتی ہے[۵]۔

۱؎ دیکھو۔ تاریخ استاد امام شیخ محمد عبدہٗ۔ تالیف سید محمد رشید رضا۔ مطبوعہ مطبع منار ۱۹۳۱ء

۲؎ العروۃ الوثقیٰ۔ مطبوعہ مجموعہ مطبع اہلیہ بیروت ۱۹۳۳ء صفحہ ۶۶۔ یہ ایک ہفتہ وار رسالہ ہے جسے امام افغانی اور عبدہٗ نے ۱۸۸۳ء میں پیرس سے شائع کیا تھا اور ۸ ماہ کے عرصہ میں اس کے ۱۸ نمبر شائع ہوئے تھے

۳؎ دیکھو المنار ۱۳۲۵ھ صفحہ ۳ ۴؎ اسی سال کا المنار صفحہ ۱۵۸

۵؎ کتاب الاسلام والنصرانیہ مع العلم والمدنیۃ۔ تالیف شیخ محمد عبدہ، مطبوعہ مطبع المنار ۱۳۵۰ھ صفحہ ۵۶۔

اسی مبارک تحریک کا اثر تھا کہ نضیلت مآب شیخ الازہر محمد مصطفےٰ المراغی مرحوم (متوفی ۱۹۴۵ء) نے اصلاح دارشاد کا کام شروع کیا تھا جس کے پسندیدہ اثرات قانون سازی، درس و تدریس اور صحافت کی دنیا میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ شیخ الازہر نے علماء کی ایک جماعت کو نمائندہ بنا کر اس بین الاقوامی کانفرنس میں بھیجا جو قانون مقارن (Comparative Law) یعنی قانون کے تقابلی مطالعہ و تحقیق کے لئے اگست ۱۹۳۷ء میں بمقام لاہی (The Hague) منعقد ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نمائندہ جماعت نے کانفرنس میں انسانی مسؤلیت کی تشریح شریعت اسلامی کے مطابق کی۔ نیز ثابت کیا کہ شریعت اسلامی ایک مستقل قانون ہے جو رومی قانون سے متاثر نہیں ہوا اور جو عصر جدید کے بدلتے ہوئے حالات کے لئے بھی مناسب ہے۔ کانفرنس نے ان کے ساتھ اس اعتبار سے موافقت کی کہ قانون اسلامی اپنے اندر تغیر و تبدل کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں اتنی وسعت موجود ہے جو عصر جدید کی زندگی کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کر سکے۔ نیز کانفرنس نے یہ قرارداد پاس کی کہ آئندہ جلسوں میں شریعت اسلامی کے مسائل پر بحث کرتے وقت دیگر زبانوں کی طرح عربی زبان استعمال کرنے کی بھی اجازت ہوگی۔

اسی طرح ایک اور مجلس شیخ المراغی کی زیر قیادت قائم ہوئی جس کے ممبر نضیلت مآب شیخ عبدالمجید سلیم مفتی مصر اور شیخ فتح اللہ سلیمان چیف جسٹس مصر بھی تھے[۱] اس مجلس کا نصب العین یہ تھا کہ رفتارِ زمانہ کے مطابق تمام مذاہب اسلامی کا لحاظ رکھتے ہوئے شخصی حالات کی ایسی آئین بندی کی جائے جو صرف ایک مذہب کی تقلید کے قید و بند سے بالکل آزاد ہو۔

مصر کی وطنی تحریک

آخر میں تحریک وطنی شرعی کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تحریک اس لئے اٹھی تھی کہ حکومت مصر نے شریعت اسلامی کو مصر کی جدید قانون سازی کے تمام شعبوں میں بنیادی حیثیت سے قائم نہیں رکھا تھا بلکہ اس میں یورپ کے قوانین کا عنصر شامل کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جب خدیو مصر اسماعیل پاشا نے ترکوں سے آزادی حاصل کرنے کے شغف میں مجلۃ الاحکام العدلیہ کو ترک کر دیا تو شیخ مخلوف منیاوی کو حکم دیا کہ وہ فرانسیسی قانون کو مذہب امام مالک کے سانچے میں ڈھالیں۔ باوجودیکہ یہ ضخیم کتاب علامہ مذکور نے تمام لوازماتِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے تالیف کی تھی۔ مگر جب اس کا قانون مدنی مصری جو نپولین کے وضع کردہ قانون سے ماخوذ تھا جاری ہوا تو قدامت پسند حلقوں میں ہیجان و اضطراب پھیل گیا اور بعض لوگوں نے تو تجربہ سے ثابت کر دیا کہ اس قانون کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ قدری پاشا مرحوم نے قانون کی ایک کتاب "مرشد الحیران الی معرفۃ احوال الانسان" مرتب کی جو مذہب ابوحنیفہ سے ماخوذ تھی اور قانونِ عصر جدید کے مطابق تھی[۲]۔

---

[۱] تاریخ التشریع الاسلامی، تالیف سبکی اور اس کے ساتھی (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۵۱ اور اسکے بعد) دیکھو نضیلت مآب استاد مراغی کی وہ تقریر جس کے ذریعہ انھوں نے مجلس کے جلسہ کا افتتاح کیا تھا۔ کتاب انقضاء فی الاسلام میں جو جناب عطیہ مصطفیٰ کی تالیف ہے (مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء صفحہ ۸۰-۸۵)

(Bulletin trimestriel De la Societe de Legislation Comparee.

[۲] اسمیں ۵۴۰ دفعات ہیں۔ قدری پاشا کی تالیف قانون الاصول الشخصیۃ المصری ہے جس کے ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور انہی کی تصنیف قانون العدل والانصاف للقضاء علی مشکلات الاوقاف ہے اس میں ۶۴۶ دفعات ہیں۔

جب حکومت مصر نے قوانین ملکی پر نظرثانی کرنے اور ان کی ترمیم کی غرض سے کمیٹیاں بنائیں تو تحریک وطنی پھر شروع ہوگئی۔ علماء کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ قانون سازی کی بنیاد شریعت اسلامی پر رکھی جائے اور نئے قانون پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ ملک کے لئے اجنبی ہے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ شریعت اسلامی کو دوبارہ جاری کیا جائے جو تیرہ صدی تک ملک میں نافذ رہی ہے اور جس میں عزت وطن، عربی زبان، مذہب اور دینی روایات کو برقرار رکھنے کی پوری ضمانت موجود ہے اور جس میں ایسے گرانمایہ خزانے موجود ہیں جو ہر لحاظ سے معاشرۂ جدیدہ اور قومی ترقی کے لئے مناسب حال ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شرعی قانون کی بدولت مغرب کی غلامی سے آزادی میسر آئیگی اور مصر اس قابل ہو سکے گا کہ مشرقی ممالک کے لئے نمونہ بن سکے۔ نیز صرف یہی قانون عوام کے رجحانات طبع اور ارباب حکومت کے درمیان ایسا رشتۂ یگانگت پیدا کر سکتا ہے جو ہر قانون سازی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

احکام شریعت کی تدوین کے لئے حکومت مصر نے مرحوم محمد قدری پاشا کو یہ خدمت تفویض کی تھی کہ وہ شخصی معاملات کے متعلق شرعی احکام کو مذہب حنفی کے مطابق مدون کریں۔ چنانچہ انھوں نے ان کو ۶۴۷ دفعات میں مدون کیا۔ جن میں شادی طلاق، اولاد، ہبہ، وصیت اور میراث وغیرہ سے بحث ہے۔ مصر اور دیگر اسلامی ملکوں کی شرعی عدالتوں میں اسی قانون پر عملدرآمد ہونے لگا۔ مرحوم شیخ محمد زید بک ابیانی نے اس قانون پر ایک معتبر شرح لکھی ہے جو تین جلدوں میں ہے۔

شرعی عدالتوں کے دستور العمل مجریہ سنہ ۱۹۱۱ء کی دفعہ ۲۸۰ کے مطابق اہل مصر کا تعامل حنفی مذہب کے مقبول ترین اقوال کا موید تھا۔ مگر قانون نمبرہ ۲ مجریہ سنہ ۱۹۲۰ء نے اس میں ترمیم کی اور حکم دیا کہ بعض خاص مسائل مثلاً نان و نفقہ۔ عدت اور مفقود کے بارے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کیا جائے۔

مصر کا ملک احکام شرعی کی جدید تدوین میں ہمیشہ حنفی مذہب کا پابند نہیں رہا۔ بلکہ اس اصلاحی تحریک سے متاثر ہوا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ میراث کا جدید قانون مجریہ ۶ اگست سنہ ۱۹۴۳ء اگرچہ قدری پاشا کی کتاب پر مبنی ہے۔ مگر بعض مسائل میں اس سے مختلف ہے۔ مثلاً جدید قانون نے اس مسئلہ میں شافعی مذہب کی موافقت کی ہے کہ اختلاف وطن، حتیٰ کہ غیر مسلموں کے درمیان بھی میراث کا مانع نہیں ہے[2]۔ اسی طرح سنہ ۱۹۴۶ء کا جدید قانون وقف بھی حنفی مذہب سے منحرف اور مختلف ہے۔ مثلاً واقف کو اپنے وقف سے رجوع کرنے اور وقف کو موقت بنانے کا حق دیا گیا ہے۔ نیز غیر وارث کے لئے وقف کے نصاب کو ایک ثلث تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح جدید قانون وصیت مجریہ سنہ ۱۹۴۶ء میں وصیت کو وارث کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ اور اس وصیت کو بھی معتبر سمجھا گیا ہے جو ایسے بیٹے کی اولاد کے حق میں ہو جو وصیت کرنے والے کے ساتھ ہی یا اس کی زندگی میں فوت ہو جائے۔

---

[1] ہم فضیلت مآب شیخ محمد سلیمان، نائب سکریٹری عدالت عالیہ شرعیہ کی کتاب "بای شرع تحکم" (مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۹۳۶ء) اور جناب محب الدین کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں اور فضیلت مآب شیخ احمد محمد شاکر کی کتاب "الشرع واللغۃ" کا بھی خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔

[2] اس خاص مسئلہ میں فلسطین، لبنان اور سوریا کے ملکوں نے بھی شافعی مذہب کی پیروی کی ہے۔

مصر کے مدنی (سول) قانون کی تنقیح کے لیے پہلی کمیٹی ۱۹۳۶ء میں دوسری کمیٹی ۱۹۳۶ء میں اور تیسری کمیٹی ۱۹۳۸ء کے آخر میں زیر قیادت ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری بک بنائی گئی۔ آخری کمیٹی نے تقریباً دو سال کے عرصہ میں اپنا کام مکمل کر لیا اور اس کے بعد توضیحی اور ٹھوس یادداشتیں قلمبند کیں۔

جدید مسودہ قانون میں ۱۴۹ دفعات ہیں اور وہ تین ماخذوں سے لیا گیا ہے۔ قانون مقارن اجتہاد القضاء المصری اور شریعت اسلامیہ۔ ذیل کے مسائل شریعت اسلامیہ سے لئے گئے ہیں۔ حقوق کے بیجا استعمال کا نظریہ، عدم امتیاز کی ذمہ داری، قرضہ کی حوالگی، عارضی واقعات کے مبادی، مرض الموت کے احکام، غبن، مدت کمنگی، حق شفعہ اور ہبہ وغیرہ کے تفصیلی احکام۔ اسی طرح مسودۂ قانون کی پہلی دفعہ میں یہ منظور کیا گیا ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں اگر شرعی یا رواجی حکم موجود نہ ہو تو قاضی قیاس کے ذریعہ استنباط احکام کا مجاز ہے۔[2]

اس طرح مصر کا ملک اپنے قوانین میں آزاد ہو گیا ہے جس طرح کہ وہ ۱۹۴۹ء سے مخلوط عدالتوں کو منسوخ کر کے اپنے عدالتی معاملات میں آزاد ہو گیا ہے۔

ترکی

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حکومت عثمانی نے اپنے قانون میں مغربی قوانین میں سے کیا کچھ لیا اور کس طرح مجلۃ الاحکام العدلیہ کی تدوین ہوئی۔ اب ہم مختصراً یہ بتائیں گے کہ اس کے بعد ترکی قانون میں کیا کیا ترمیمات ہوئیں۔

سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت میں ترکی ترقی کی تحریک نے ۱۹۰۸ء میں سابقہ حکومت کے خلاف وہ بغاوت شروع کر دی جس کے نتیجہ میں دستوری اصلاحات منظور ہوئیں۔ اس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ ترکی عوام کا میلان طبع۔ جدت پسندی اور موروثی روایات ترک کرنے کی طرف ہو گیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے تو چلا چلا کر اصلاحات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اور بعض جیسے محمد عبیداللہ آفندی نے یہ تجویز پیش کی کہ احساس قومی بیدار رکھنے کے لئے قرآن کریم کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا جائے۔

جب تحریک وطنی ترکی قوم کو نئی زندگی بخشنے والے مصطفیٰ کمال پاشا یا مصطفیٰ اتاترک کے زیر قیادت کامیاب ہو گئی تو قومی اور مذہبی آزادی کے جدید روپ میں اصلاحات ظاہر ہوئیں جن کا مقصد خلافت اسلامی کو ختم کرنا اور غیر ترکیوں کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ کیونکہ جونہی ترک معاہدۂ لوزان ۱۹۲۳ء میں کامیاب ہو کر لوٹے تو انھوں نے اسی سال ۲۹ اکتوبر کو جمہوریہ ترکیہ کا اعلان کر دیا لیکن سلطان عبدالمجید آفندی کی خلافت ابھی برقرار رکھی۔

دوسرا سال شروع ہوتے ہی خلافت منسوخ کر دی گئی۔ خلافت عثمانی کے تمام افراد کو ترکی سے جلا وطن کر دیا گیا شیخ الاسلام

---

[1] دیکھو اس مسودہ قانون پر تقریر ڈاکٹر سنہوری کی جو انھوں نے مصری پارلیمانی میٹنگ میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء میں کی تھی اور جو مجلۃ القانون والاقتصاد کے بارھویں سالانہ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۵۲۰ - ۵۵۱۔

[2] اس کا ذکر نیز نقطہ نظر مقالۃ الکتاب نیز اس سے پہلے باب میں ہے۔

کا منصب اور تمام شرعی عدالتیں موقوف ہوگئیں۔ تمام رجعت پسندانہ تحریکوں مثلاً مولویہ اور بیکتاشیہ طریقوں کو ختم کر دیا گیا۔ اور انگریزی ٹوپی کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد قرآن کریم کا ترجمہ ترکی زبان میں کرایا گیا۔ عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کو اختیار کیا گیا۔ اور ترکی زبان میں سے بقدر امکان عربی وغیرہ تمام غیر ترکی الفاظ نکال دیئے گئے۔

اس سے دنیائے قانون سازی میں یکدم بڑا زبردست انقلاب آ گیا۔ کیونکہ ترکوں نے اس وقت کے وزیر عدلیہ محمود اسعد بیگ[1] کی تصریح کے مطابق تضیع اوقات اور دردسری سے بچنے کے لئے یورپ کے کسی جدید قانون کو منتخب کرنے کا ارادہ کر لیا۔

چنانچہ اس جدید قانون کا ترجمہ کیا گیا اور بغیر رد و قدح کے کابینہ کی اتفاق رائے سے اسے منظور کرا لیا جیسے نپولین نے اپنا قانون بلا تفصیلی بحث و مباحثہ کے منظور کرا لیا تھا۔ اس طرح ترکوں کو ایک مفصل قانون مع اپنی شرح کے تیار مل گیا۔ اور گذشتہ زمانہ کا جہلا بالرائے کا سلسلہ ختم ہوا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ترکی نے ۱۹۲۶ء میں سوئٹزرلینڈ کا قانون فوجداری اور پھر وہاں کا قانون دیوانی[2] بغیر کسی قابل ذکر ترمیم کے اختیار کر لیا۔

زیادہ واضح الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ترکی کا قانون دیوانی تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بالکل سوئٹزرلینڈ ہی کا قانون ہے۔ ترمیم کی مثال یہ ہے کہ سن بلوغ کی میعاد ترکی میں (دفعہ ۱۱ کی رو سے) پورے اٹھارہ سال ہے اور سوئٹزرلینڈ میں (دفعہ ۱۴ کی رو سے) پورے بیس سال۔

اس نئے قانون کے ذریعہ مجلۃ الاحکام العدلیہ اور تمام شرعی قوانین منسوخ ہوگئے۔ چنانچہ ترکوں نے مرد اور عورت کے حصہ وراثت میں اور خاص اسباب کی بناء پر عدالتی طلاق طلب کرنے میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات قائم کر دی اور ایک سے زیادہ نکاح ممنوع قرار دیا اور مختلف المذہب میاں بیوی کا نکاح جائز قرار دیا وغیرہ۔

اس جدید صورت گری کے باوجود ترکوں نے حکومت کا مذہب اسلام ہی رکھا اور اسے قانون سے الگ کر دیا۔ چنانچہ مذہب کا تعلق صرف عقیدہ سے رہ گیا اور قانون کا تعلق حکومت سے۔ مذہب اور مذہبی علماء سے قانون کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔

جمہوریہ لبنانیہ

زمانۂ قدیم میں لبنان ملک شام (سوریا) میں ایک پہاڑ کا نام تھا۔ یہ علاقہ عہد عثمانی میں ۱۸۶۴ء کے بعد ترکوں کے وقت سے امور داخلیہ میں آزاد تھا۔ لبنان ہمیشہ عرب کے ان مردم خیز علاقوں میں شمار ہوا ہے۔ جہاں کے ارباب علم نے ادب عربی کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور جنھوں نے اپنی ثقافت اور اپنے علم سے اپنے وطن کو سر بلند کیا ہے اسی طرح اہل لبنان غیرت قومی میں مشہور ہیں اور انھوں نے عربی قومیت کی بیداری میں بھی حصہ لیا ہے۔ چنانچہ وہاں کے مشہور شاعر ابراہیم یازجی نے اپنے قصیدے کی ابتداء یوں کی ہے۔ تنبھوا واستفیقوا ایھا العرب

---

[1] اس کی تصریح الکونت اوسترو روغ المہ: نے اپنے رسالہ "اصلاح انقرہ" (The Angora Reform) لندن ۱۹۲۶ء صفحہ ۸۶-۸۷ میں کی ہے۔　[2] سید خالد شاہبندر بغدادی نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔

جب گزشتہ جنگ عظیم ختم ہوئی تو لبنان حکومت فرانس کے زیر اثر آگیا اور اس نے ۱۹۲۰ء میں لبنان کبیر کے نام سے اپنی آزادی کا اعلان کردیا اور اس میں کچھ ساحلی اور اندرونی علاقے بھی شامل ہو گئے۔ پھر ۱۹۲۶ء میں جمہوریہ لبنانیہ کا اعلان کیا گیا اور فرانس کے زیر اثر ایک لبنانی رئیس جمہوریہ مقرر ہوا۔

آخر کار فرانسیسی اقتدار ختم ہوا اور ایک خونریز بغاوت کے بعد ۹ نومبر ۱۹۴۳ء کے قانون کی رو سے ملک کے دستور اساسی میں ترمیم کردی گئی اور دنیا کی تمام بڑی بڑی حکومتوں نے لبنان کی مکمل آزادی تسلیم کرلی۔ اس کے بعد تمام اختیارات فرمانروائی مع خارجی نمائندگی کے ملکی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

چنانچہ آزاد لبنان نے ایک مستقل حکومت کی حیثیت سے سان فرانسسکو کانفرنس میں حصہ لیا اور میثاق اقوام متحدہ تیار ہوا[1]۔ میثاق مذکور کی دفعہ ۸ و دفعہ ۷ کی رو سے لبنان جمعیت الاقوام کا ممبر قرار پایا اور وہ تمام ایسی بندشوں سے آزاد قرار دیا گیا جو اس کی سیادت اور آزادی پر اثر انداز ہوں۔ چنانچہ لبنان کی حکومت نے سیادت کے تمام حقوق سنبھال لئے۔ اور اسے حق دفاع کے علاوہ یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ بیرونی ملکوں میں اپنے نمائندے بھیج سکے۔ پھر ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو تمام غیر ملکی فوجیں لبنان کی سرزمین سے نکل گئیں اور مجلس نیابت نے مخلوط عدالتوں کو منسوخ کردیا۔

لبنان کا قانونی دستور العمل دولت عثمانیہ کا مجلۃ الاحکام العدلیہ تھا۔ مگر فرانس کی حکومت بالادست نے اپنے انتداب کے وقت سے کبھی صرف اپنی رائے سے اور کبھی مقامی حکومت کے باہمی مشورے سے متعدد معاملات ملکی کے لئے آہستہ آہستہ آئین و قوانین بنانے شروع کردیئے۔

درحقیقت بہت سے آئین و قوانین جاری ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض عام ہیں اور بعض خاص۔ ہم یہاں مختصر طور پر ان میں سے صرف چند اہم قوانین کا ذکر کرتے ہیں:۔ ملکی ہونے کا قانون۔ قانون معاہدات۔ عدالت ہائے دیوانی کا قانون اساسی۔ قانون تجارت۔ قانون فوجداری۔ اور شرعی عدالتوں کے نظم و نسق کا قانون۔

پہلا قانون (ملکی ہونے کا) فرانس کے ایوان بالا نے بذریعہ قرار داد نمبر ۳۳۳۹، مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو صادر کیا جس کا اعلان سرکاری طور پر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو کیا گیا۔ اس قانون میں ۲۷۰ دفعات ہیں۔ اور اس میں اراضی، حقوق شخصی جیسے ملکیت و نفع اندوزی شراکت و ہبہ وغیرہ اور ان حقوق کا حاصل کرنا یا ان کو دوسرے کی طرف منتقل کرنا یا ان کا ساقط ہونا وغیرہ معاملات سے بحث کی گئی ہے۔ اسی قانون کے ذریعہ مع سابقہ فیصلوں کے جو پابندی، آزادی اور اراضی[2] کے رجسٹر سے متعلق ہیں اور مع اس کی ترمیمات بعد کے آجکل کے اس قانون ملکیت کی تشکیل عمل میں آئی جو ان مشرقی ملکوں میں رائج ہے جو فرانس کے ماتحت ہیں۔ جیسے سوریا و لبنان۔

---

[1] لبنانی کابینہ نے ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء کے اجلاس میں بمطابق قانون ۲۵ ستمبر ۱۹۴۵ء میثاق پر مہر تصدیق ثبت کی۔

[2] فیصلہ جات نمبر ۱۸۶ - ۱۸۹، مجریہ ۱۵ اپریل ۱۹۲۶ء، اور ان کی ترمیمات۔

اس قانون سے وہ تمام احکام سابقہ منسوخ ہوگئے جو قانون جدید کے احکام کے خلاف ہیں، مثلاً مجلہ کا وہ قانون منسوخ ہوگیا جو مسائل حق شفعہ اور دیگر حقوق شخصی وغیرہ سے متعلق ہے۔

پھر ۱۹۲۵ء میں حکومت نے فرانسیسی جج جناب روپرس (Ropers) کو قانون عہد و مواثیق وضع کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس کا مسودہ پروفیسر لویس جوسران کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو لیون یونیورسٹی میں لا کالج کے افسر اعلیٰ ہیں اور فرانسیسی ہائی کورٹ میں مشیر قانونی رہ چکے ہیں۔ اور جو فرانس کی قانونی دنیا میں بہت سی مشہور کتابوں اور مقالات کے مصنف ہیں۔[1] انھوں نے اس میں بنیادی تبدیلیاں کرکے اسے از سر نو لکھا اور آخری مسودہٗ قانون تیار کیا۔ پھر یہ مسودہٗ قانون لبنان کی مجلس مشاورت قانونی میں پیش ہوا۔ مجلس نے ضروری تنقیحات کے بعد اسے لبنان پارلیمنٹ میں پیش کردیا۔ پارلیمنٹ نے اسے منظور کرنے کے بعد سرکاری اخبار میں مشتہر کیا کہ یہ قانون تاریخ تشہیر سے تیس ماہ بعد نافذ ہوگا۔ چنانچہ یہ قانون اا اپریل ۱۹۳۲ء کو مشتہر کیا گیا اور اا اکتوبر ۱۹۳۴ء سے اس پر عملدرآمد شروع ہوا۔

لبنان کے قانون معاہدات میں ۱۱۰۷ دفعات ہیں اور اس کے دو حصے ہیں۔ ایک وہ جس میں موجبات سے عام بحث کی جاتی ہے۔ یعنی موجبات کی اقسام ان کے ماخذ اور سبب اس کی منتقلی اور منسوخی وغیرہ عام حالات۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں خاص معاملات سے بحث کی جاتی ہے۔ جیسے خرید و فروخت۔ تبادلہ۔ ہبہ۔ ٹھیکہ۔ امانت۔ قرض، عاریۃً دینا۔ وکالت۔ شراکت، دھوکا اور غیر یقینی معاملات (بیمہ۔ قماربازی)۔ رہن۔ مدت العمر کی پنشن، مصالحت اور کفالت۔

قانون معاہدات کے ساتھ قرارداد نمبر ۴۶ ل مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا الحاق کیا گیا۔ جس میں جائداد منقولہ کے رہن اور اس کے حقوق سے بحث ہے۔

اسی طرح اس قانون کی بعض دفعات میں الحاقی قوانین کے ذریعہ ترمیم کی گئی ہے۔ جن میں سے اہم یہ ہیں ا۔ آرڈیننس نمبر ۱۵ ل مجریہ ۵ نومبر ۱۹۳۲ء بذریعہ ترمیم دفعہ ۱۳۱۔ متعلقہ حفاظت مال وزر اور قانون مجریہ ۲۷ مئی ۱۹۳۷ء بذریعہ ترمیم دفعہ ۶۵۲ و ۶۵۷ بابت مزدوری مزدوران

قانون مذکور کی دفعہ ۱۱۰۶ میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے کہ اس قانون کی رو سے مجلہ کے تمام احکام اور وہ احکام شرعیہ جو اس قانون کے خلاف ہیں یا موافق نہیں، منسوخ کئے گئے۔ چنانچہ قانون مذکور کی رو سے مجلہ کے تمام احکام مع ان احکام کے جو قوانین سابقہ سے بھی منسوخ ہوچکے تھے منسوخ قرار پائے۔ سوائے چند قابل ذکر احکام کے ا۔ جیسے نابالغ، دیوانہ۔ مخبوط الحواس اور بیوقوف کی بیع کا صحیح نہ ہونا بربنائے دفعہ ۹۴۱ اور اس کے بعد۔ اس میں بھی ان ترمیمات کا لحاظ رکھا گیا ہے جو قانون موجبات کی دفعہ ۲۱۵-۲۱۸

---

[1] ان میں اہم یہ ہیں۔ کتب دروس القانون المدنی الوضعی۔ تین حصوں میں اور کتاب نظریہ سوء استعمال الحقوق:
Cours de droit Civil Positif francais; D. L' esprit des droits et de Leur relativite, theorie dite L' abus des droits.

کی رو سے اس میں کی گئی ہیں اور جیسے زراعت، آب رسانی اور شجر کاری کے مسائل[1] اور جیسے اس مریض کے تصرفات جو مرض الموت میں مبتلا ہو خصوصاً جب کہ ایسے مریض کے تصرفات مسلمانوں کے نزدیک وصیت کے حکم میں شمار ہوتے ہیں، نیز دیگر احکام جو شکار، بنجر زمین، اور افتادہ اراضی سے متعلق ہیں وغیرہا۔

جس روز قانون معاہدات نافذ ہونے والا تھا۔ اس روز بروئے آرڈیننس نمبر ۲ ل، مجریہ یکم فروری ۱۹۳۳ء لبنان کی عدالت ہائے دیوانی کا قانون جاری کیا گیا۔ اس قانون میں لبنان کی تشریعی کمیٹی نے بہت سی تنقیحات نکالیں۔ یہ قانون جناب بارو (Perroud) پروفیسر لیون کالج کا وضع کیا ہوا ہے۔

اسی طرح عدالت ہائے دیوانی کے قانون اساسی کی رو سے وہ تمام قوانین منسوخ کر دیئے گئے جو اس کے خلاف تھے یا موافق نہ تھے جیسے حکام صلح کا قانون اور حکومت عثمانی کی عدالت ہائے دیوانی کا قانون اساسی اور اس کا ضمیمہ اور قانون اجراء[2]۔ قانون جدید میں یہ چند اہم ترمیمات کی گئی ہیں:— ترمیم عدالتی تنظیم، اختصاص وصلاحیت اور قرضدار کو سزائے قید دینے کے ضابطے۔

اسی طرح حکومت نے لبنان کے لئے قانون تجارت بنانے کا کام پروفیسر کوہندی اور پروفیسر گونو کے سپرد کیا۔ یہ دونوں لیون کالج میں قانون تجارت کے پروفیسر ہیں۔ چنانچہ ان دونوں نے مسودۂ قانون بنایا جس میں قانونی مشاورتی کمیٹی نے ترمیم کی[3] اور فابیا پروفیسر فرانسیسی لا کالج بیروت نے اس میں تنقیحات نکالیں۔ اس کے بعد یہ قانون سرکاری اخبار میں بتاریخ ۷ اپریل ۱۹۴۳ء[4] مشتہر کیا گیا۔ اس شرط پر کہ تاریخ اشاعت سے چھ ماہ بعد نافذ ہوگا۔ اس میں چند ایسے امور کی صراحت کی گئی ہے جو پہلے قانون میں نہ تھے جیسے شرکت مجہول کے احکام (الانونیم) تاجروں کا سرکاری رجسٹر میں اندراج اور صلح احتیاطی وغیرہ۔ اس طرح اس قانون کی دفعہ ۱۱ کی رو سے شادی شدہ عورت اپنے خاوند کی صراحۃً یا کنایۃً اجازت کے بغیر تجارت کی مجاز نہیں۔ یہ حکم اس عام قانون کے خلاف ہے جس پر ان ملکوں میں عملدرآمد ہوتا ہے۔

حکومت لبنان نے جدید قانون فوجداری جاری کرنے کا بھی ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ اس نے عدالت اپیل کے بڑے بڑے ججوں کی ایک کمیٹی کو قانون مرتب کرنے کا حکم دیا[5]۔ کمیٹی نے کام شروع کر دیا اور اسے مکمل کر کے اس جدید قانون کا مسودہ پیش کر دیا۔ اس کا ترجمہ کرانے کے بعد حکومت نے بذریعہ آرڈیننس[6] اسے منظور کر لیا۔ اور سرکاری اخبار میں بتاریخ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء اسے شہر کیا کہ وہ یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء

---

[1] مجلہ کی دفعہ ۱۳۳۱ تا ۱۴۴۹، نیز دیکھو قانون موجبات کی دفعہ ۹۲۳ اور نظام آب رسانی کا ریزولیوشن نمبر ۱۲ ل، مجریہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۴ء

[2] سوا ان معاملات نفاذ کے جن کا اجرا ایسی اراضی پر کیا گیا ہو جن کی خسرہ بندی نہیں ہوئی (قانون جدید کی دفعہ ۸۵۶)

[3] جو حکم سرکاری نمبر ۶۰۱۹، مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۲۹ء تالیف کی گئیں۔

[4] بروئے آرڈیننس نمبر ۳۰۴، مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۲ء

[5] مرتبہ جناب فواد عون، وثیق القصار کو قیلیب بولس بروئے فیصلہ وزیر اعظم و وزیر عدل نمبر ۹۲۱ مجریہ ۲۲ مئی ۱۹۳۹ء

[6] نمبر ۳۴۰ مورخہ یکم اپریل ۱۹۴۳ء

سے نافذ ہوگا۔ یہ قانون لبنان کے واضعان قانون اور ججوں کی پختہ کاری کی دلیل ہے اور اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ اہل لبنان بحیثیت قانون سازی اور بلحاظ عام حالات کے آزادی کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

مزید برآں قانون فوجداری کو لبنان کے قوانین سابقہ کے برعکس جرح و تنقید کے لئے مجلس قانون ساز میں پیش نہیں کیا گیا اس لئے ہم قدرتی طور پر اس قانون میں موضوع اور لسانی اصلاحات کی کچھ فروگذاشتیں پاتے ہیں۔

لبنان کے جدید قوانین میں سے چند اہم قوانین یہ ہیں:- قانون عقوبات عسکری۔ قانون عمل۔ قانون تجارت بحری۔ قانون عدالت۔ قانون جنگلات اور قانون فوج۔

مختصر یہ کہ لبنان کے قواعد جدیدہ یورپ کے بہترین قوانین سے ماخوذ ہیں۔ اور ان جدید آراء اور قانونی نکتہ سنجیوں سے مالا مال ہیں جو فرانس جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین میں پائی جاتی ہیں۔

آخر میں ہم عدالت ہائے جدیدہ شرعیہ کے اس قانون نظم ونسق کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو بروئے آرڈیننس نمبر ۲۴۱ مورخہ ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء جاری ہوا جس کے ذریعہ ان سنی اور جعفری عدالت ہائے مذہبی کی قرار واقعی تنظیم ہوگئی جو شخصی معاملات کی نگراں ہیں بس اس قانون کی رو سے ہائی کورٹ منسوخ کردی گئی اور اس کے بجائے شرعی عدالت اپیل قائم ہوئی جس میں شرعی قاضی ہیں۔ اور ان کے ساتھ عدالت کا ایک جج بھی رہتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ عام دعووں کو عدالت شرعی تک پہنچائے۔ سنی عدالتوں کا دستور العمل حکومت عثمانی کا فیملی قانون اور مذہب امام ابوحنیفہ کی قابل ترجیح آراء ہیں۔ جعفری عدالتوں میں مذہب جعفری اور خاندانی قانون کے اس حصہ پر عمل درآمد ہوتا ہے جو مذہب جعفری سے موافقت رکھتا ہے۔ (دفعہ ۱۱۱)

اس کے علاوہ حکومت لبنان نے اپنی سیاسی آزادی کے بعد یا تو بہت سے خاص قوانین جاری کئے یا قوانین سابقہ میں ترمیم کی تاکہ قومی رجحانات کے تقاضوں اور آزادی سے پیدا شدہ صورت حالات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کی جاسکے۔

سوریا

سوریا یعنی شام کا ملک بھی اپنے ہمسایہ اور بھائی لبنان کی طرح ویسے ہی تاریخی ادوار میں سے گذرا ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے وہ دولت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا۔ جنگ ختم ہونے پر وہ اس سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسے فرانسیسی انتداب کے تحت رکھ دیا گیا۔ اس دور انتداب میں فرانسیسیوں اور وطن پرستوں کے درمیان برابر کشمکش جاری رہی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اہل فرانس نے ایک دستور جاری کیا مگر اسے کئی بار معطل کردیا۔ اس دستور کے مطابق ملک کی حکومت جمہوری پارلیمنٹ قرار پائی۔

پھر دوسری جنگ عظیم ہوئی اور برطانیہ اور فرانس کی فوجیں سنہ ۱۹۴۱ء میں سوریا میں داخل ہوگئیں اور اسی سال جنرل کاترو نے انتداب کے خاتمہ کا اعلان کردیا۔ پھر سنہ ۱۹۴۳ء میں دستور دوبارہ جاری ہوا اور اس کی دفعہ ۱۱۶ کے مطابق سوریا کی پارلیمنٹ نے قرار دیا کہ اہل سوریا کی عدم موافقت کی وجہ سے فرانسیسی انتداب نافذ نہیں ہوسکتا۔ آخر کار سنہ ۱۹۴۶ء میں تمام غیر ملکی فوجیں سوریا سے نکل گئیں اور تمام مخلوط عدالتیں منسوخ کردی گئیں۔

سنہ ۱۹۴۹ء کے اثنا میں فلسطین کے حوادث کے بعد سوریا کی فوجوں نے حسنی الزعیم اور سامی حناوی کے ذریعہ دو مرتبہ حکومت کو الٹ

دیا۔ پھر اسی سال ادیب ششکلی نے تیسری مرتبہ انقلاب برپا کیا اور دستوری حکومت کو از سر نو قائم کیا۔ پھر ایک خاص کانسی جمعیت نے سوریا کے لئے ایک جدید دستور وضع کیا۔ جس کی تاریخ ۵ ستمبر ۱۹۵۰ء تصدیق ہوئی۔ اس دستور کی رو سے ملک کا نظام حکومت جمہوری پارلیمنٹ ہے۔ اور شخصی آزادی، بنیادی حقوق اور دیموقراطی اصول وضاحت سے بیان کئے گئے۔ اس دستور نے یہ امر بھی واضح کیا کہ سلطنت کے رئیس کا دین اسلام ہوگا اور شریعت اسلامی قانون سازی کا اولین سرچشمہ ہوگا۔

سوریا کی جمہوریت میں آجکل تقریباً ۳۵ لاکھ لوگ بستے ہیں جن میں سے اکثر مسلمان ہیں اور ذاتی معاملات میں حنفی مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔

سول قانون کے لحاظ سے سوریا بھی لبنان کی طرح عثمانی قوانین اور مجلۃ الاحکام العدلیہ کے تابع تھا لیکن لبنان کے برعکس یہاں عہد انتداب میں بھی یہ قوانین جاری رہے سوائے قانون ملکیت کے جسے فرانس نے ۱۹۳۰ء میں صادر کیا اور سوریا اور لبنان میں نافذ کیا۔

قانون سازی کی تحریک آزادی کے زمانہ ہی میں شروع ہو سکی۔ چنانچہ سب سے پہلا قانون جو بتاریخ ۱۰ جون ۱۹۴۸ء جاری ہوا، قانون شہادت تھا۔

اس سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ جو ۱۹۴۹ء میں حسنی الزعیم کے زمانے میں برپا ہوا ایک تشریعی انقلاب بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ وزیر عدالت استاد اسعد کورانی کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور تین بڑے اہم قوانین صادر ہوئے:۔ قانون مدنی۔ قانون تجارت اور قانون تعزیرات۔ یہ تمام جزوی ترمیم کے ساتھ مصری۔ لبنانی اور عراقی قوانین سے منقول ہیں۔ ان کے متعلق چند الفاظ بے محل نہ ہونگے۔

قانون مدنی میں جو ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا ۱۱۳۰ دفعات ہیں اور اس کا اکثر حصہ مصر کے سول قانون سے ماخوذ ہے اور کچھ حصہ لبنان کے قانون سے منقول ہے۔ پھر اسی سال قانون تعزیرات اور قانون تجارت صادر ہوئے۔ قانون تجارت ۷۷۴ دفعات پر مشتمل ہے اور تجارتی اسناد کے بارے میں وہ اس ضابطہ سے ماخوذ ہے جسے عرب لیگ کی قانونی کمیٹی نے بنایا ہے اور جہاں تک باقی مسائل کا تعلق ہے۔ وہ لبنان، عراق اور مصر کے تجارتی قوانین سے ماخوذ ہے۔ برعکس لبنانی قانون کے اس میں لمیٹڈ کمپنیاں بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔

سوریا کا قانون تعزیرات ۵۶۷ دفعات پر مشتمل ہے اور اسکے اصول اور اکثر دفعات لبنانی قانون سے ماخوذ ہیں۔

طلوع اسلام آپ کے سامنے ان تحریکوں کا سرسری جائزہ آگیا جو مختلف اسلامی ممالک میں قانون سازی کے سلسلہ میں آجکل کارفرما ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگرچہ بعض ممالک میں ابھی تک قدامت پرستی سے وابستگی کے رجحانات موجود ہیں لیکن اکثریت انہی لوگوں پر مشتمل ہے جو آزادی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کوشش میں مذہب کے پیرہن کو الگ رکھ کر خالص سیکولر انداز سے قوانین مرتب کرنے لگ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو قوانین ہمارے قدامت پرست طبقہ

(باقی صفحہ ۷۹ کے نیچے)

اب غیر ملکی عام اشیائے اسٹیشنری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے

کیونکہ ہم نے مال کے بنانے میں اسی خوشنمائی پائیداری اور معیار کو ملحوظ رکھا ہے جو انگلینڈ، جرمن اور امریکہ وغیرہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار ملک کی مصنوعات کو استعمال کرنے پر ہے۔

جنرل منیجر جنرل اسٹیشنرز لمیٹڈ (مینوفیکچرز)

نقد و نظر

(۱) جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث

جمعیۃ اہلِ حدیث گوجرانوالہ نے یہ ایک کتابچہ شائع کیا ہے جو شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل السلفی ؒ کا رقم فرمودہ ہے۔ اس کا مرکزی نکتہ تو یہ بتانا ہے کہ جماعتِ اسلامی جو اپنے آپ کو حامیٔ حدیث اور متبعِ سُنّت بتاتی ہے اُن کی اصلی پوزیشن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنّفِ کتاب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ

> میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ بلکہ یہ نظریات تمام ائمۂ حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (صفحہ ۱۱)

نیز کتاب کی تقریب کا پہلا فقرہ یہ ہے

> مولانا مودودی کا حدیث پاک کے متعلق جو نظریہ ہے وہ اہلِ حدیث کے لئے نیا نہیں۔ وہ تو بارہا کا چبایا ہوا نوالہ ہے ان لوگوں کا جن کے مزعومہ اور مبتدعہ نظریات کے خلاف جب کوئی مستند حدیث سامنے آتی تو وہ اس کے مسترد کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتے اور رنگ اس کو علمی دے لیا کرتے تھے۔ (صفحہ)

لیکن اس کتاب میں مسلک اہلِ حدیث کے متعلق بعض معلومات ایسی اہم اور واضح ہیں جن کا قارئین طلوعِ اسلام تک پہنچانا ضروری سمجھا گیا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے ہم نے اس کتاب کا تعارف (تنقید نہیں بلکہ محض تعارف) مناسب خیال کیا ہے۔

(۱) یہ بحث کہ حدیث اور سنت میں فرق کیا ہے آجکل بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث اور سنت ہم معنی ہیں اور آنحضرت صلعم کے قول فعل اور تقریر سب کو شامل ہیں۔ (صفحہ ۲۲)

(۲) حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ

> تحقیق و تثبت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا۔ .... جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمۂ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا۔ اور سنّت سے خروج کے مرادف ...... حدیث خدا کی طرف سے وحی ہے اور دین میں

قرآن کے بعد حجت ہے۔ (صفحہ ۴۲)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

استدلال اور اخذ مسائل کے وقت ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے۔ اور اسی طرح آنحضرتؐ کو اس کا علم دیا گیا جیسا کہ قرآن کا عن حسان بن عطیۃ کان جبرئیل ینزل بالقرآن والسنۃ و یعلمہ ایاھا کما یعلمہ القرآن" جبرئیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے۔ آنحضرت کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں ماخذ ہیں اور بیک وقت ماخذ ہیں۔

(بحوالہ صواعق مبینہ ۲۳۳/۲ شاطبی جلد ۴ و جامع بیان العلم) (صفحہ ۶۰)

(۳) حفاظ حدیث کی عصمت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

اگر حدیث دین ہے تو اس کی حفاظت کا ذمہ دار حق تعالیٰ کو ہونا چاہیئے، یہ حفاظت حفاظ حدیث ہی کی معرفت سے ہوئی ہے اس لئے مجموعی حفاظت اور اجتماعی عصمت سے ان کو یقیناً حصہ ملا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس میں سے کوئی چیز ضائع ہو چکی ہے تو اس کی ضرورت نہ تھی اور جس چیز کی ضرورت تھی اسے محفوظ رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث کو عطا فرمائی۔ (صفحہ ۳۶)

(۴) اب یہ سوال پیدا ہوا کہ حدیث کے وہ کونسے مجموعے ہیں جنہیں (اس کتاب کے مطابق) یہ درجہ حاصل ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہ معلوم ہے کہ زمان کے اعتبار سے احادیث کے موجودہ مجموعوں میں مؤطا امام مالکؒ کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے اہل مدینہ کا عمل درج کیا ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب میں اس سے اختلاف کیا گیا ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں۔

شہادت عثمانؓ اور بعد کے واقعات اور حوادث کا ایک سبب اہل الرائے اور کبار صحابہ کی عدم موجودگی بھی تھی۔ ان حالات میں اہل مدینہ کے عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ قرین قیاس تو یہ ہے کہ اس وقت کے عمل کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ (صفحہ ۳۳)

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

اہل مدینہ بعض اہم سنتوں کو ترک کر چکے تھے۔ (صفحہ ۳۴)

ایک اور مقام پر حافظ ابن حزم کی سند سے لکھتے ہیں کہ

یہ زمانہ خیر تو گذر گیا۔ اس کے بعد مدینہ کے والی عمرو بن سعید، حجاج بن یوسف ایسے فاسق اور ظالم بھی بنے اور عمرو بن حزم اور عمر بن عبد العزیز ایسے صالح اور نیک بھی۔ اور اہل مدینہ کا عمل ان کے اثرات کا دوسرا نام تھا۔ (صفحہ ۴۵)

(۵) اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے اور انہیں تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہوا ہے...... ان

احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (صفحہ ۵۵)

ان مقامات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ جمعیت اہل حدیث کے نزدیک بخاری اور مسلم کی ہر حدیث قرآن کی طرح وحی ہے جسے حضرت جبریلؑ لے کر نازل ہوئے اور اس وحی میں اور قرآن میں کوئی تفریق نہیں۔ جو ان کی کسی ایک حدیث کے متعلق بھی کسی قسم کا شک کرتا ہے وہ کافر ہے اور ملت سے خارج۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین اہل حدیث کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں۔ کیونکہ ان کے علاوہ احادیث کے ان مجموعوں کو کوئی بھی ایسی حیثیت نہیں دیتا۔ اسی بنا پر انھوں نے لکھا ہے کہ ابن مبارک نے فرمایا کہ

> دین اہل حدیث کے پاس ہے۔ باتیں بنانا معتزلہ کے پاس، جھوٹ رد و نقض کی عادت اور اہل الرائے حیلوں کے عادی ہیں۔ (صفحہ ۵۶)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں کہ

> معتزلہ اور ائمۂ کلام اور دوسرے بدعی گروہوں کا تعلق عموماً شاہی درباروں سے رہا۔ عباسی دربار تو ان مناظرہ بازیوں میں مشہور تھا۔ وہاں یہ سب کچھ فتح اور شکست اور دفتری اقتدار کے لئے ہوتا تھا۔ ان حالات میں سخن سازی اور غلط روی، ہر چیز جائز سمجھی جاتی تھی تاکہ دربار میں اعزاز حاصل ہو۔ ایسے وقت میں پارٹی بازی لازمی ہے اور جھوٹ سے پرہیز ناممکن۔ (صفحہ ۵۶)

آپ نے غور فرمایا کہ امت کے سلف صالحین کو ان کے ہاں سے کیا سرٹیفکٹ مل رہا ہے۔

کتاب میں منکرین حدیث کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ چلتے چلتے اسے بھی دیکھتے جائیے۔ وہ فہرست حسب ذیل ہے اور کتاب کے صفحات صفحہ ۴۶ و صفحہ ۴۷ پر مرقوم

منکرین حدیث	کونسی احادیث کا؟	کب
۱۔ خوارج	جو اہل بیت کے فضائل میں تھیں	سنہ ۲۰۰ھ
۲۔ شیعہ	جو احادیث صحابہؓ کے فضائل میں تھیں	سنہ ۲۰۰ھ
۳۔ معتزلہ اور جہمیہ	احادیث صفات	
۴۔ قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع	جو احادیث غیر فقیہہ صحابہ سے مروی ہیں	سنہ ۲۲۱ھ
۵۔ متاخرین فقہاء سے قاضی ابوزید دبوسی وغیرہ	" " " " "	"
۶۔ اس کے بعد معتزلہ اور متکلمین کے ساتھ متاخرین فقہاء کی ایک مختصر سی جماعت	اصول اور فروع دونوں میں ان حضرات نے خبر واحد سے اختلاف کیا	سنہ ۴ ہجری کے بعد
۷۔ یورپین تہذیب سے مرعوب، گروہ مولوی	یہ حضرات فن سے قطعاً ناواقف تھے ان کی	

چراغ علی سرسید احمد خاں وغیرہ	تحقیق میں احادیث تاریخ کا ذخیرہ ہیں۔ جو ان کے پیمانہ کے موافق ہوا قبول کر لیا اور جو مخالف ہوا ترک کر دیا۔	۱۳۰۰ھ کے قریب قریب
۸۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی میسری محمد رمضان گوجرانوالہ، مولوی حشمت علی لاہوری۔ مولوی رفیع الدین ملتانی	احادیث کا بالکلیہ انکار	۱۳۰۰ھ کے بعد۔
۹۔ مولوی احمد دین صاحب امرتسری مسٹر غلام احمد پرویز۔ یہ حضرات سرسید سے متاثر ہیں لیکن جاہل اور غیر محتاط۔ مولوی احمد دین بعض متواتر اعمال کو مستثنیٰ سمجھتے تھے۔	ان کے نزدیک قرآن و حدیث اور پوراوین ایک کھیل ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی نظریہ جسے ہر وقت ہیں بدلنے کا حق حاصل ہے۔	۱۴۰۰ھ
۱۰۔ مولانا شبلی مرحوم، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی۔ اور عام فرزندان ندوہ، باستثنائے حضرت سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ	یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے انداز فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقۂ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔	۱۴۰۰ھ ۱۳۰۰ھ

معلوم نہیں ان صاحب کو اتنی لمبی چوڑی فہرست دینے کی ضرورت کیا تھی۔ صاف لکھ دیا جاتا کہ جو ہم سے متفق نہیں (متقدمین ہوں یا متاخرین) وہ سب منکرین حدیث فلہذا کافر اور ملت سے خارج ہیں۔ کل حزب بما لدیھم فرحون کا یہی تو مطلب ہے۔

بہرحال چونکہ (جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے) ہم اس کتاب پر تنقید نہیں کر رہے۔ اس لئے ہم صرف ان تصریحات کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن جمعیۃ اہل حدیث سے یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب ان کے نزدیک باقی مسلمانوں کی حالت یہ ہے تو پھر یہ مسلمانوں کے فرقوں کو مسلمہ اسلامی فرقے کس طرح قرار دیتے ہیں۔ ہم نے یہ اس لئے لکھا ہے کہ جن اکتیس علماء نے دستور پاکستان کی تدوین کے وقت مسلمانوں کے فرقوں کو مسلمہ اسلامی فرقے قرار دیا تھا ان میں جماعت اہل حدیث کے نمائندے بھی تو موجود تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب مسلمان وہی ہے جو مسلم اور بخاری کے مندرجات کو وحی منزل من اللہ سمجھے تو ان مجموعوں کی تدوین سے پہلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں جس قدر مسلمان گذرے ان کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے۔؟

۲— سرگذشت مجاہدین

محترم غلام رسول صاحب مہرؔ کی گرانقدر تصانیف "سید احمد شہیدؒ" (دو جلدیں) اور "جماعت مجاہدین" کا تذکرہ اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں آچکا ہے۔ اور یہ اسی سلسلۂ زریں کی چوتھی (اور ہمیں یہ دیکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ) آخری کڑی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مجاہد کبیر سید احمد علیہ الرحمہ کے بعد ان کی جماعت سے متعلقہ حضرات پر کیا کیا مصیبتیں گذریں اور ان تمام تکالیف اور صعوبات میں انھوں نے کس پختگیٔ ایمان اور سیرت کا مظاہرہ کیا۔ یہ کتاب اس اعتبار سے اور بھی زیادہ دلچسپ ہو گئی ہے کہ یہ سلسلہ چپکے چپکے دبے پاؤں بڑھتے بڑھتے خود ہمارے دور تک آملا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے چھ سو اسی صفحات پر مشتمل ہے اور مجلد کی قیمت بارہ روپے ہے۔ ناشرین ہیں کتاب منزل لاہور

اس حسین و سادہ و رنگین داستان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین محض چند عقائد اور عبادات تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ زندگی کے عملی مسائل بھی اس کے اندر محصور تھے۔ چنانچہ صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے کہ

> آخوند مولوی محمد محسن عرف دودو میاں) نے الارض للہ کا نعرہ لگایا اور اعلان کر دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بطور وراثت اس پر قابض ہو۔ جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں وہی اس کے مالک ہیں۔ حکومت اپنے واجبات ان سے لے سکتی ہے نام نہاد مالکانِ اراضی ان سے کوئی لگان وصول کرنے کے حقدار نہیں۔ اس اعلان پر بڑے بڑے زمیندار دودو میاں کے جانی دشمن بن گئے۔

ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔ جب شیخ الہند مرحوم نے اپنی کوششوں سے امیر حبیب اللہ خاں کو اس پر رضامند کر لیا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر دے تو امیر نے ایک بہت بڑے پیر صاحب سے دعائے خیر کے لئے کہا۔ پیر صاحب نے کہا کہ میں تین روز استخارہ کرنے کے بعد جواب دوں گا۔ چوتھے روز بتایا کہ ہندوستان پر حملہ کرنا افغانستان کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو گیا۔

> کہا جاتا ہے کہ اس کارکردگی کے صلہ میں انگریزوں نے پیر صاحب کو پچاس لاکھ روپیہ دیا۔　　(صفحہ ۵۹۱)

اس کتاب میں اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ جب ہندوستان کے وہابیوں پر یہ قیامت ٹوٹ رہی تھی تو اس وقت جس شخص نے انھیں اس عذاب سے نجات دلائی وہ سرسید تھا (صفحہ ۴۲۳) یہ وہی سرسید ہے جسے اب "وہابی" (یعنی اہلِ حدیث حضرات) منکرِ حدیث بتا رہے ہیں۔

بعض مقامات پر محترم مہر صاحب شدتِ عقیدت میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جن سے ہمیں اختلاف ہے۔ مثلاً شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے کارناموں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ان میں چھان بین اور غور و فکر کی کمی تھی۔ لیکن اس کے بعد لکھا ہے کہ

> لیکن میدانِ عمل کی ہر شئے کا حسن صرف جذبۂ عشق اور وارفتگیٔ حب مقاصد پر موقوف ہے۔ یہاں تدبیروں کی

پختگی، منصوبوں کی پائیداری اور عقل و خرد کی دور بینی اور مصلحت اندیشی کو کون پوچھتا ہے (صفحہ ۵۶)

یہ حقیقت نگاری نہیں، جذبات پرستی ہے۔ میدانِ عمل کا حسن جذبۂ عشق کے ساتھ تدبیروں کی پختگی اور منصوبوں کی پائیداری پر موقوف ہے۔ ان میں سے ایک کی بھی کمی ہو جائے تو عمل کا حسن قائم نہیں رہتا۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔

(۳ و ۴) ۱۸۵۷ء و ۱۸۵۷ء کے مجاہد

یہ دونوں کتابیں بھی محترم مہر صاحب کے رشحاتِ قلم کی رہینِ منت ہیں۔ اور کتاب منزل۔ لاہور کی طرف سے شائع کردہ۔ پہلی کتاب بڑے سائز کے دوسو بارہ صفحات پر اور دوسری کتاب اسی سائز کے تین سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اوّل الذکر کی قیمت چار روپے آٹھ آنے اور دوسری کی ساڑھے پانچ روپے آٹھ آنے ہے۔

جیسا کہ عنوانات سے ظاہر ہے یہ کتابیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ مہر صاحب کی خصوصیت ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں محنت، کاوش اور پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہی خصوصیات ان کتابوں میں بھی موجود ہیں اور اس سانحہ کے سلسلہ میں بیشتر ایسی معلومات بھی سامنے آگئی ہیں جو کسی دوسری طرح شاید ہی بے نقاب ہو سکتیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے متعلق مختلف لوگوں کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔ لیکن جہاں تک معلومات کا تعلق ہے وہ ان کتابوں سے بہتر شاید ہی کہیں اور مل سکیں۔

(۵) Revelation And Reason in Islam

آپ نے دیکھا کہ کتاب کا عنوان کس قدر جاذب ہے اور جب اس کے ساتھ پروفیسر آربری کا نام بھی منسلک ہو تو اس کی جاذبیت میں کونسی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ یہی جاذبیت تھی جس کی وجہ سے ہم کشاں کشاں اس کتاب کی طرف بڑھے لیکن بڑے ہی مایوس ہوئے۔ عنوان سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ پروفیسر آربری نے یہ بتایا ہو گا کہ اسلام میں وحی اور فکرِ انسانی کے مقامات کیا ہیں۔ اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ لیکن ان میں صرف ان مباحث کا ذکر ہے جو معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ہوئے تھے یا جو متکلمین اور صوفیہ میں مابہ النزاع رہے ہیں اور انھیں بھی بڑے سطحی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اہلِ مغرب میں بھی اب یہ بات آگئی ہے کہ جسے تھوڑی سی شہرت نصیب ہو جائے وہ پھر اپنے آپ کو محنت اور کاوش سے مستغنی سمجھ لیتا ہے۔ اور اپنے نام سے اہلِ مشرق کو مرعوب کر کے اپنے مفاد و مقاصد حاصل کرنے لگ جاتا ہے۔

۶- THE KORAN

کوئی صاحب ہیں (N.J. DAWOOD) انھوں نے قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور (Penguin)

والوں نے اسے شائع کیا ہے۔ ترجمہ میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن جس مقصد کے لئے ہم نے اس کا تعارف ضروری سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں سورتوں کی ترتیب عجیب ہے۔ ہمارے ہاں جس قدر قرآن چھپتے ہیں ان میں سورتوں کی مروجہ ترتیب ہی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے ترتیب نزول کے مطابق سورتوں کو مرتب کیا ہے اور دو ایک تراجم اس قسم کے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن زیر نظر ترجمہ میں سورتوں کی ترتیب نہ تو مروجہ قرآن کے مطابق ہے اور نہ عینیہ ترتیب نزول کے مطابق بلکہ مترجم کے ذاتی ذوق کے مطابق۔ اس کے جواز میں انھوں نے لکھا یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلعم قرآن کریم کو جمع اور مدون کرکے نہیں گئے تھے بلکہ یہ کام آپ کے بعد صحابہؓ نے سرانجام دیا تھا جو صاحب وحی نہیں تھے اس لئے ان کی دی ہوئی ترتیب دین میں سند قرار نہیں پا سکتی۔ اور جب یہ ترتیب سند نہیں تو پھر ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ جو ترتیب اسے پسند آئے اختیار کرلے۔

یہ دلیل آپ کو مضحکہ انگیز تو نظر آئے گی لیکن ہماری کتب احادیث میں (جن میں بخاری اور مسلم تک شامل ہیں) قرآن کے جمع اور تدوین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے وقت قرآن کریم (معاذ اللہ) عجیب ابتری کی حالت میں تھا۔ صحابہ نے ایک کمیٹی بٹھائی اور انھوں نے جس طرح بن پڑا قرآن کو جمع کرلیا۔ اور اس کے بعد اس میں کئی تبدیلیاں بھی ہوئیں (ان امور کی تفصیل مقام حدیث کی دوسری جلد میں ملے گی) ان تصریحات کی روشنی میں اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب کو وحی کی سند حاصل نہیں تو وہ کوئی زیادتی نہیں کرے گا۔

طلوع اسلام نے ایک عرصہ کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ قرآن اپنی موجودہ شکل اور ترتیب میں نبی اکرم صلعم کی زندگی ہی میں اسی طرح سے مدون ہو چکا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور تمام روایات جو یہ بتاتی ہیں کہ قرآن کی ترتیب و تدوین بعد میں جاکر ہوئی تھی، قرآن کی ثقاہت کو مجروح کرنے کے لئے ایک گہری سازش کا نتیجہ ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں طلوع اسلام کو منکر حدیث قرار دیدیا گیا۔

ہمارے نزدیک اسلامی سلطنتوں کا یہ فریضہ ہونا چاہیئے کہ وہ دیکھیں کہ کوئی قرآن اس طرح نہ شائع ہو جو قرآن کی مروجہ ترتیب سے مختلف ہو۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ معلوم کتنے وادادے پیدا ہو جائیں گے جو اپنی اپنی پسند کے مطابق اس کی ترتیب کو الٹنے لگ جائیں۔

لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کا اعلان کردیا جائے کہ قرآن کریم اپنی موجودہ شکل میں رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں موجود تھا اور وہ تمام روایات جو اس کے خلاف جاتی ہیں وضعی ہیں۔ لیکن ایسا کہنے کے لئے جرأت کی ضرورت ہوگی کیونکہ ایسا کہنے والے کو مُلّا منکر حدیث یا طلوع اسلامی کہہ دے گا۔

ہندو اوتار زاہد صدیقی صاحب سابق مبلغ دیندار انجمن کا ایک پمفلٹ ہے جس کی ضخامت چھوٹے سائز کے چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایم انجینئرنگ ورکس۔ مقابل باغ طارق بلڈنگ لارنس روڈ کراچی سے ہر آنے کے

ٹکٹ بھیج کر منگایا جاسکتا ہے۔

اس پمفلٹ میں زاہد صدیقی صاحب نے حیدرآباد دکن کی رسوائے زمانہ دیندار انجمن کا کچا چٹھا شائع کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ تحریک درا صل قادیانی تحریک کا مُنتنی ہے اور اس جماعت کو قادیانی مرکز سے اپنی تبلیغ واشاعت کے لئے رقوم بھی ملتی رہتی ہیں۔ زاہد صدیقی صاحب نے اس تحریک کے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے وہ ایسے ہیں کہ کوئی سمجھدار آدمی بھی ان سے فریب نہیں کھا سکتا۔ اور جونہی ان میں سے کوئی ایک بات بھی سامنے آجائے اس کی فریب خوردگی کا طلسم پاش پاش ہوجانا چاہیئے مگر ہمیں حیرت ہے کہ زاہد صدیقی صاحب عرصۂ دراز تک نہ صرف اس جماعت میں داخل رہے بلکہ اس جماعت کے مبلغ بنے رہے اور عرصہ دراز کے بعد آج وہ تائب ہوکر اس جماعت کا کچا چٹھا عوام کے سامنے کھولنے کھڑے ہوگئے ہیں۔ کیا یہ تمام باتیں جو آج وہ عوام کے سامنے پیش فرمارہے ہیں آج ہی ان کے سامنے آئی ہیں۔ اور اب سے پہلے انھیں مطلق ان کا کوئی علم نہیں تھا؟ اور اگر انھیں ان کا علم تھا تو کیا اس وقت ان میں اتنی عقل بھی نہیں تھی جو انھیں بتا سکتی کہ اس قسم کی خرافات خدا کا دین نہیں بن سکتیں۔ یہ بات کم از کم ہماری سمجھ سے بالا ہے۔

اگر صورت یہ ہو کہ ایک شخص کسی جماعت کے ظاہری محاسن کو دیکھ کر اس میں شامل ہوگیا ہے اور اس جماعت نے اپنے سربستہ راز اس سے مخفی رکھے ہیں۔ پھر ایک دن کسی طرح ان کے یہ مخفی راز اس پر منکشف ہوجاتے ہیں اور وہ اس جماعت سے بیزاری کا اعلان کردیتا ہے۔ تو یہ روش قابلِ فہم ہے لیکن ہمارے ہاں یہ عام روش ہوگئی ہے کہ لوگ پہلے تو مختلف جماعتوں کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور ان کے سرگرم مبلغ بن کر کام کرتے رہتے ہیں لیکن جب ان جماعتوں سے ان کے معاملات پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو وہ ان سے تائب ہوکر مسلمانوں میں ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی ان جماعتوں کا کچا چٹھا کھولنا شروع کردیتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں وہی ہوتی ہیں جنھیں جانتے بوجھتے یہ صاحب اُس جماعت کے ساتھ شامل تھے۔ مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

جہاں تک رسالہ کا تعلق ہے وہ اس لحاظ سے یقیناً قابلِ قدر ہے کہ جن لوگوں کو اس جماعت کے مشئومہ عقائد سے آگاہی نہیں ان کے لئے یہ رسالہ اس جماعت کے ایک اہم رکن کے قلم سے اس کے متعلق معلومات بہم پہنچا دیتا ہے۔

٭

ابوبکرؓ | شائع کردہ مکتبۂ جدید، انارکلی لاہور۔ ضخامت ۴۷۴ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت مجلد دس روپے۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی تصنیف سیدنا ابوبکر کا ترجمہ ہے۔ مترجم ہیں شیخ محمد احمد صاحب پانی پتی۔ اس میں حضرت صدیق اکبرؓ کے حالات زندگی اور ان کے عہد خلافت کے اہم واقعات کا تفصیلی تذکرہ آگیا ہے۔ ترجمہ شگفتہ ہے اور ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اس ترجمہ کی کامیابی پر محمد احمد صاحب کو قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں صدیق اکبرؓ کے عہد میں عالم اسلامی کا نقشہ بھی دیا گیا ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے عہد میں آفتابِ

اسلام کی شعاعیں کہاں کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔ کتاب اردو ٹائپ میں عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ جلد اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

جہاں تک اصل کتاب کا تعلق ہے ہمیں افسوس ہے کہ ہیکل صاحب نے اس میں ندرتِ فکر اور تحقیق و کاوش کا کوئی عمدہ نمونہ پیش نہیں کیا۔ مثلاً جمع قرآن کا باب ہم نے از اوّل تا آخر پڑھا تاکہ معلوم کر سکیں کہ ہمارے عہد کے اس مصری مفکر نے اس باب میں اپنی تحقیقات کے کیا نتائج پیش کئے ہیں مگر ہمیں اس باب کو پڑھ کر حد درجہ مایوسی ہوئی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہمارے ہاں یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے (اور اس کی تائید روایات سے کی جاتی ہے) کہ رسول اللہ قرآن کریم کو یونہی منتشر حالت میں چھوڑ گئے تھے اور یہ عہد حضرت صدیقؓ میں جمع ہوا۔ تو ہیکل صاحب اس سے مطمئن نظر نہیں آتے مگر ساتھ ہی نہ وہ اس غلط خیال کی تردید کی جرأت اپنے اندر پاتے ہیں اور نہ ہی تحقیق و کاوش سے اس کا کوئی قابل قبول محل متعین کر سکے ہیں۔ سارا باب پڑھ جانے کے باوجود بھی قاری کچھ طے نہیں کر پاتا کہ بات کیا تھی۔ اور اس کے متعلق ہیکل صاحب کا خود اپنا رجحانِ خاطر کیا ہے۔ مصنف سے تو مترجم زیادہ صاحب بصیرت ہیں جنہوں نے اپنے حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ قرآن خود رسول اللہ کے زمانہ میں اسی شکل میں مدوّن و مرتب ہو چکا تھا جس شکل میں وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمیں یہ حاشیہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ (جمع قرآن کی صحیح پوزیشن کے متعلق ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب مقام حدیث (جلد دوم) میں متعلقہ عنوان دیکھئے)

بہرحال فکر و تحقیق کی رُو سے ان کی اس کتاب کا کوئی مقام نہیں۔ البتہ جہاں تک تاریخی معلومات و آرا کا تعلق ہے یہ مبسوط کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اور اس لحاظ سے مفید بھی ہے۔

انسان نے کیا سوچا؟

زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۲×۲۹/۸ ۳۶۸ صفحات قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی ۲۹

جامعین احادیث کے متعلق

تاریخ کا ایک اہم سوال

(محترم مولوی) محمد ابراہیم ناگی۔ امرتسری

ملک عرب جزیرۃ العرب اور اسکے ملحقات کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ عرب کا اکثر و بیشتر حصہ ریگستانوں اور چٹیل میدانوں پر مشتمل ہے۔ اس کا صرف ایک ہی صحرا اتنا وسیع و عریض ہے کہ وہ سارے ملک کا چوتھا حصہ ہے اور اسی وجہ سے اس صحرا کو ربع الخالی کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں "نفوذ" "جوف" اور "دہناء" کے صحراؤں نے بقیہ رقبہ کا بہت بڑا حصہ اپنے اندر لپیٹا ہوا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ملک بننے یا آباد ہونے کی قابلیت سے محرومی کی وجہ سے قدیم زمانے میں اس خطۂ ارض کا کوئی نام ہی نہ تھا۔ اور اگر کسی نے اس ملک کا ذکر کرنا ہوتا تو وہ اسے "غیر آباد ملک" کہہ کر اپنا مفہوم ادا کر لیتا۔ حتیٰ کہ قرآنی زبان میں بھی اس کا ذکر "وادٍ غیر ذی ذرع" کے جملہ سے کیا گیا ہے۔

بنابریں ملک عرب کے محدود آباد علاقوں کی آبادی کو افزائش کی صورت میں ملک سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ چونکہ اس جزیرہ نما کے تین اطراف (یعنی مشرق۔ جنوب اور مغرب) سمندروں سے محصور ہیں۔ اسلئے جب کبھی آبادی زائد Overflow ہوئی اور اسے نقل مکانی کی ضرورت پیش آئی تو اس نے شمال ہی کا رخ کیا۔ چونکہ ملک عرب کا شمال۔ شمال مشرق اور شمال مغرب زرخیز خطۂ زمین ہے۔ اس لئے بھی عربوں کا میلان طبع انہی ممالک کی طرف ہوا کرتا تھا۔ یہ ممالک عراق۔ فلسطین، شام اور اردن وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ جغرافیائی اصطلاح میں ان علاقوں کو (FERTILE CRESCENT) (زرخیز ہلال) کہتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ قبل از ظہور اسلام عربوں کی زائد آبادی کی کئی امواج ان ممالک میں جا کر آباد ہوتی رہیں۔ اس ہجرت یا نقل مکانی کا اثر یہ ہوا کہ ان ملکوں کے اصل باشندوں نے بھی عربوں سے ملاپ کی وجہ سے عربی زبان اور معاشرت کو قبول کر لیا۔ اور اس کا ایک مفید نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسلام کی دعوت وہاں کے عرب اور غیر عرب لوگوں کو دی گئی تو انہیں قبول اسلام میں کوئی خاص ہچکچاہٹ پیش نہ آئی۔ "قرآناً عربیاً" کی تعلیم عربی بولنے والوں کو اجنبی معلوم نہ ہوئی۔ اور ان Arabacised

ممالک میں اسلام بآسانی پھیل گیا۔

یہ سلسلہ ظہورِ اسلام کے بعد زیادہ باقاعدہ اور ضروری ہو گیا۔ یہاں تک کہ اکثر صحابہ نے بھی ان علاقوں کو اپنے توطن کا شرف بخشا۔ اور وہ تا زیست وہاں تبلیغ اسلام کرتے رہے۔

ایران اس کے برعکس اسلام سے قبل کوئی عرب قبیلہ یا گروہ ایران جاکر آباد نہ ہوا تھا۔ کیونکہ عرب اور ایران کے درمیان سمندر (خلیج فارس) حائل ہے۔ ایرانی اپنی الگ تہذیب کے مالک تھے اور اس پر ان کو فخر تھا۔ اور جب عرب بحیثیت فاتح ایران میں گئے تو ان کو وہاں وہ کامیابی حاصل نہ ہوئی جو انہیں دیگر ممالک مذکور میں ہوئی تھی۔ برعکس اس کے ایرانی ضمیر اسلام اور عربی تہذیب قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مفتوح ہونے کے بعد بھی عربوں سے اپنی قلبی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے جو ہزار سال سے فضائے عالم میں گونج رہا ہے۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار   عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

آج تک بھی یہ حال ہے کہ عربی الفاظ ہماری زبان سے چن چن کر خارج کئے جا رہے ہیں۔ درمیانی صدیوں میں عربوں اور ایرانیوں کی جو آویزشیں رہیں ان میں سلطنتیں تباہ ہوئیں اور لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ علقمی اور نصیر طوسی کی سازشوں نے بغداد اور نواح بغداد میں لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کرادیا۔ نیز قرامطہ اور باطنیہ وغیرہ فرقوں کی تاریخ بھی خون سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث کا "معتبر ترین" ذخیرہ جسے "صحاح ستہ" کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے۔ ان کے جامعین حجاز۔ عراق وغیرہ کی بجائے ایران سے اٹھے............ یہ کیوں؟

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ عہد نبوت میں یا اسکے فوراً بعد اہل حجاز میں سے صحبت یافتگانِ رسالت مآبؐ۔ یا وہ لوگ جنہیں ان اصحابؓ کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی یا کم از کم وہ لوگ جو قربِ زمان و مکان کی سہولتوں کے باعث اس کام کے اہل تھے جامعین صحاح ہوتے لیکن ان میں سے کوئی بھی صحاح میں سے کسی ایک مجلّد کا جامع یا مرتب نہیں۔ صحاح ستہ کی تالیف ان حضرات کے حصہ میں آئی جو عہد نبوت سے سینکڑوں برس بعد ہوئے اور مدینۃ النبی سے ہزاروں کوس کے فاصلہ پر پروان چڑھے۔ یقیناً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطری اقتضاء اور قدرتی توقع کے مطابق جو ہونا چاہیئے تھا وہ کیوں نہیں ہوا؟ اور جو نہیں ہونا چاہیئے تھا وہ کس طرح ہو گیا؟

"مشکلے دارم........ ز دانشمند مجلس باز پرس"

صحاح ستہ اور ان کے جامعین صحاح ستہ کے معنی ہیں حدیث کی چھ بہت صحیح کتابیں۔ جو سنی مسلمانوں میں مقبول ہیں ان کے جامعین کے سن ولادت اور وفات اور ان شہروں کے نام ذیل میں درج کئے

جاتے ہیں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ رسول اللہ کے ارشادات گرامی کو صحت کے ساتھ نقل اور جمع کرنے کا کام یہ حضرات زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے یا وہ حضرات جو خود حضورؐ کے تربیت یافتہ (یعنی خلفائے راشدین یا صحابہ کبارؓ) تھے۔

صحاح ستہ کی پہلی کتاب

(۱) صحیح بخاری ہے۔ یہ واضح رہے کہ پیغمبر اسلام کی رحلت ۶۳۲ء میں ہوئی تھی اور جامعین صحاح ستہ میں سب سے پہلے جن بزرگ کا نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ امام محمد بن اسماعیل بخاری ہیں جو ۸۱۰ء میں یعنی حضورؐ کی وفات کے ۱۷۸ سال بعد بخارا میں پیدا ہوئے اور ۸۷۰ء مطابق ۲۶۰ھ میں سمرقند کے قریب موضع خرتنگ میں فوت ہوئے۔ بخارا اور سمرقند ان دنوں مملکت ایران میں شامل تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں جب صفوی خاندان کا عروج ہوا تو ایران دو حصوں میں بٹ گیا۔ مغربی حصہ جو موجودہ ایران کہلاتا ہے شیعوں کا مرکز بن گیا اور مشرقی حصہ جس میں سمرقند، بخارا، خیوا اور موجودہ افغانستان شامل تھے سنیوں کے حصہ میں آیا۔ مختصراً امام بخاری دراصل ایرانی تھے۔

بخارا جو اب کمیونسٹ شہر ہے۔ مدینہ منورہ سے قریباً دو ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ امام بخاری کے زمانہ میں نقل و حرکت کے وہ ذرائع موجود نہ تھے جو اب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شہر بہ شہر اور قریہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انھوں نے جرح اور تعدیل کے اپنے مقرر کردہ معیار کے مطابق صرف ۷۳۰۰ احادیث کو صحیح پایا اور اپنی کتاب میں ان کو درج کر دیا۔ ان ۷۳۰۰ احادیث میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکررات کو شمار نہ کریں تو باقی ۲۷۶۲ رہ جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ امام بخاری صاحب وحی نہ تھے۔ چونکہ انھوں نے ان احادیث کو خود جمع کیا تھا اس لئے انھیں اس کا حق حاصل تھا کہ اپنے شخصی فیصلے کے مطابق لاکھوں حدیثوں کو رد کر دیں۔ لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) ان کے بعد امت کے کسی اعلےٰ سے اعلےٰ فرد کو بھی یہ حق نہیں رہا کہ ان کی منتخبہ روایات میں سے کسی ایک کو بھی قرآن، عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر کسنے کی جسارت کرے۔ اگرچہ نظری طور پر کہا یہی جاتا ہے کہ احادیث کے پرکھنے کا معیار یہی ہے۔

صحاح کی دوسری کتاب

صحیح مسلم ہے۔ اس کے جامع امام مسلم بن حجاج تھے۔ یہ بھی ایران کے مشہور شہر نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۸۲۶ء (۲۰۴ھ) میں اور وفات ۸۷۵ء (۲۶۱ھ) میں ہوئی۔ وہ امام بخاری کے شاگرد تھے انھوں نے کل تین ہزار احادیث منتخب کیں۔

امام بخاری اور مسلم کی کتابیں صحیحین کہی جاتی ہیں۔

صحاح کی تیسری کتاب

جامع ترمذی ہے ..... جس کی تالیف امام ترمذی نے کی۔ ان کا پورا نام ابو عیسیٰ محمد ترمذی ہے۔ ترمذ بھی ایران ہی کا شہر ہے یہ بزرگ ۸۳۱ء (۲۰۹ھ) میں پیدا ہوئے اور ۸۹۱ء (۲۷۹ھ) میں فوت ہوئے۔

صحاح کی چوتھی کتاب

سنن ابو داؤد ہے۔ اس کے جامع امام ابو داؤد ہیں جو سیستان (ایران) میں سنہ ۸۲۴ء (سنہ ۲۰۲ھ) میں متولد ہوئے اور سنہ ۸۹۷ء (سنہ ۲۷۵ھ) میں وفات پا گئے۔ انھوں نے اپنے پانچ لاکھ کے مجموعے میں سے صرف ۴۸۰۰ حدیثیں قابل قبول سمجھیں۔

صحاح کی پانچویں کتاب

اس سلسلۃ الذہب میں پانچواں نام امام ابن ماجہ کا آتا ہے۔ یعنی ابو عبداللہ محمد بن زید بن ماجہ۔ یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش سنہ ۸۳۱ء (سنہ ۲۰۹ھ) میں اور رحلت سنہ ۸۹۵ء (سنہ ۲۷۳ھ) میں ہوئی۔

صحاح کی چھٹی کتاب

سب سے آخر میں امام ابو عبدالرحمٰن نسائی کا نمبر آتا ہے جو مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک چھوٹے سے گاؤں نسا میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات سنہ ۹۲۵ء (سنہ ۳۰۳ھ) ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ سب بزرگ ایرانی ہیں۔ نیز یہ کہ تمام مجموعے بنو امیہ کی عربی حکومت کی بجائے بنی عباس کی نیم عجمی حکومت میں مدون ہوئے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ موطا امام مالک زماناً و مکاناً سب سے زیادہ ترجیح کی مستحق ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ امام مالک سنہ ۱۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ وہ مدینۃ النبی کے رہنے والے تھے۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور ساری عمر اسی شہر میں رہ کر اسی جگہ فوت ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے اصحاب حدیث نے امام مالک کے مجموعہ احادیث "موطا" کو "صحاح" میں شامل نہیں کیا۔

حدیث کے مدون اوّل

حدیث کے مدون اول محدثین کے نزدیک امام محمد بن شہاب زہری متوفی سنہ ۱۲۴ھ تسلیم کیے گئے ہیں۔ وہ مقام "ایلہ" کے رہنے والے تھے۔ بعد میں مدینہ طیبہ آئے اور پھر مدنی مشہور ہوئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر انھوں نے حدیثیں لکھیں۔

دوسرا طبقہ محدثین

امام زہری کے بعد ابن جریج نے مکہ میں۔ محمد بن اسحٰق اور مالک بن انس نے مدینہ میں۔ ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں۔ سفیان ثوری نے کوفہ میں۔ اوزاعی نے شام میں۔ معمر نے یمن میں۔ اور ہشیم نے واسط میں حدیث کی کتابیں مدون کیں۔ یہ جملہ حضرات دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں گذرے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کی کتاب حدیث امت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ سوائے موطا کے۔

تیسرا طبقہ محدثین

تیسرا طبقہ محدثین بھی عرب لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کی تالیفیں مسند کہلاتی ہیں۔ ان بزرگوں میں نمایاں شخصیتیں عبداللہ بن موسیٰ۔ مسدد بصری۔ اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد وغیرہ ہیں۔ چوتھے طبقہ میں جامعین صحاح ستہ آتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۲ طلوع اسلام نومبر سنہ ۱۹۵۰ء)

لہٰذا دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایرانی جامعین حدیث کو جو تیسری صدی ہجری میں ہوئے دوسری صدی ہجری کے عرب جامعین پر ترجیح کیوں دی گئی۔

صحاح اربعہ

حدیث کی جن چھ صحیح ترین کتابوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہ سنّی مسلمانوں کی مقبول ترین کتابیں ہیں۔ اسی ایران کے اندر ہمیں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو اپنے ہی ملک کی جمعِ حدیث کی ان کوششوں پر مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنے مجموعے الگ تیار کئے۔ (اور صحاح ستہ کے جواب میں اپنی الگ "صحاح اربعہ" تجویز کیں۔ یہ شیعہ حضرات کی صحیح ترین کتابیں ہیں۔ یعنی

(۱) الکافی۔ جس کے مؤلف ابو جعفر محمد ہیں۔ جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی وفات ۹۴۱ء (۳۲۹ھ) میں ہوئی۔

(۲) دوسری کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" ہے جو شیخ محمد ابن علی متوفی ۹۹۱ء (۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۳) تیسری کتاب "تہذیب" ہے جو شیخ ابو جعفر محمد بن حسن متوفی ۱۰۶۷ء (۴۶۰ھ) نے جمع کی۔

(۴) اور چوتھی "استبصار" ہے جو انہی شیخ صاحب کی تالیف ہے۔

ان بزرگوں میں سے بھی کوئی شخص نہ حجازی ہے نہ عراقی نہ شامی۔ ویسے ان کا دعویٰ ہے کہ ائمہ اہل بیت سے روایت کرتے ہیں کیونکہ "اہل بیت ادری بما فی البیت" (گھر والے گھر کی باتوں کو بہتر جانتے ہیں) لیکن تعجب ہے کہ ائمہ اہل بیت میں سے بھی کسی نے کوئی مجموعہ احادیث خود مرتب نہیں فرمایا۔

یا اولی الابصار

مذکورہ بالا تفصیلات کے پیش نظر ایک طالب حق یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر جمع حدیث کا کام ایسا تھا کہ اسکے بغیر دین، اسلام صحیح معنی میں دین اسلام نہیں بن سکتا تو سب سے پہلے صحابہ کرامؓ اسکی طرف متوجہ کیوں نہ ہوئے۔ جنہوں نے اپنے محبوب و محترم پیغمبرؐ کی حیات افروز باتیں بلا واسطہ سنی تھیں۔ اور اگر ان سے فروگذاشت ہوئی تھی۔ تو حجاز، عراق، شام و مصر وغیرہ (عربی ممالک) کے ان لوگوں نے جنہوں نے صحابہ کرامؓ کی صحبت پائی تھی۔ احادیث کو جمع کیوں نہ کیا اور یہ اہم کام اتنی مدت کے بعد اہل ایران کے حصہ میں کیوں آیا؟ اس کے ساتھ ہی جب ہم ان مجموعوں میں اس قسم کی روایات دیکھتے ہیں (جن میں سے ایک دو نیچے درج کی جاتی ہیں) تو اس سے حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت کے اس حصہ —

وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (۶۲/۳)

کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے تو آپ پر سورۂ جمعہ نازل ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (مذکورہ بالا آیت کے ٹکڑے میں) وَآخَرِينَ مِنْهُمْ میں کن لوگوں کا ذکر ہے تو آپ نے تین دفعہ سوال دہرانے پر اپنا ہاتھ سلمان فارسی کے کندھے پر رکھ کر فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا (سب سے اونچا ستارہ) پر بھی ہو تو اسکی (سلمان فارسی) کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پائیں گے۔

یہ حدیث بخاری میں بھی ہے۔

ایک اور حدیث اسی مطلب کی ملاحظہ ہو۔ سورۂ محمد (۴۷/۳۸) کا آخری ٹکڑا ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ

اگر تم پیٹھ پھیر دگے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدل دے گا

یعنی اے اہل عرب! اگر تم اللہ کے ان فرائض کی تبلیغ وغیرہ میں جو اس نے تمہارے ذمے عائد کئے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو "خیر امت" کا لقب دیا ہے کوتاہی کرو گے تو اللہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو امام الاقوام بنا دے گا جو ان فرائض کو اچھی طرح ادا کرے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ترمذی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لکھتے ہیں کہ اس آیت سے متعلق صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ کون ہیں جن کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا تو آپ نے سلمان فارسی کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا "اس کی قوم کو۔ اس کی قوم"

واضح رہے کہ میرزا غلام احمد قادیانی نے (جو اپنے آپ کو فارسی الاصل کہتے تھے) اپنی نبوت کی تائید میں اس روایت کو بھی پیش کیا تھا۔ ضمناً یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میرزا صاحب سے پہلے، میرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ صاحب (جنھوں نے نبوت کا دعوے کیا تھا) ایرانی ہی تھے۔

آخری گذارش

موقر جریدہ طلوع اسلام میں حدیث سے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن تاریخ کے ایک طالب العلم کی حیثیت سے میرے دل میں رہ رہ کر یہ سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ کیا کوئی اہل علم اس نکتہ پر روشنی ڈالیں گے کہ یہ تمام جامعین احادیث عرب کی بجائے ایران سے کیوں اٹھے۔ میری یہ بھی درخواست ہے کہ اس موضوع پر گفتگو خالص علمی انداز سے ہونی چاہیئے نہ کہ جذباتی طریق پر۔ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے میرے دل میں بھی سب بزرگوں کا احترام ہے۔ والسلام

ابراہیم ناگی۔ امرتسری۔

مشرقی ممالک میں قانون سازی (صفحہ ۷۳ کے بعد)

کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کے پورا کرنے کی صلاحیت قطعاً نہیں اور ان کا تشدد ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی اجازت نہیں دیتا۔

پاکستان اس وقت ایک نئے تجربہ کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ یہاں بھی دو رجحانات کارفرما ہیں۔ ایک خالص قدامت پرستانہ رجحان اور دوسرا ان لوگوں کا رجحان جو قدامت پرستی سے تنگ آکر مغرب کے سیکولر انداز کا قانون چاہتے ہیں۔ یہ دونوں رجحانات غلط اور قرآن کی منشا کے یکسر خلاف ہیں۔ ان کے برعکس ایک تیسری تحریک ہے جس کا داعی طلوع اسلام ہے۔ اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو عصر حاضر کے تقاضوں کی پوری پوری تسکین کر سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان ان تینوں راستوں میں سے کونسا راستہ اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ اس کے اسی انتخاب پر اس کے مستقبل کا دارومدار ہے۔

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت منداور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال نہ بچوں کیلئے مفید تر یا مشغلہ ہے
MISWAK
چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دوکان پر ملتا ہے